اقبال احوال و افکار

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان دہلی ۲

اقبال — احوال و افکار

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ناشر

مکتبہ نعیمیہ ۵۱۱ مٹیا محل دہلی ۶

اقبال — احوال و افکار

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ناشر

مکتبہ نعیمیہ ۵۱۱ مٹیا محل دہلی ۶

حقوق اشاعت محفوظ

اقبال

احوال ---- و ---- افکار

مصنف : ---------- ڈاکٹر عبادت بریلوی

پہلی بار جولائی ۱۹۸۱ء

باہتمام اعتقاد حسین صدیقی

قیمت :- ۳۰/=

سول ایجنٹ

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان دہلی ۲

جو اہر آفسیٹ پرنٹرز دہلی

فہرست

۱-	احوالِ اقبال ----------------	۹
۲-	افکارِ اقبال ----------------	۲۳
۳-	اقبال کا تنقیدی نقطۂ نظر ----------------	۳۹
۴-	اقبال کی عظمت ----------------	۵۹
۵-	کلامِ اقبال میں عظمتِ انسانی کا تصوّر ----------------	۷۷
۶-	اقبال ــ شاعرِ ملت ----------------	۸۵
۷-	اقبال اور تہذیبِ مغرب ----------------	۹۷
۸-	اقبال اور صنفِ لطیف ----------------	۱۱۳
۹-	اقبال کی غزل ----------------	۱۲۷
۱۰-	خضرِ راہ ----------------	۱۳۹
۱۱-	ساقی نامہ ----------------	۱۵۱
۱۲-	ذوق و شوق ----------------	۱۶۱
۱۳-	اقبال کی نثر نگاری ----------------	۱۶۹

پیش لفظ

علامہ اقبالؒ کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر ساری دنیا اور خصوصاً پاکستان میں ان کی عظیم شخصیت کو جو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، وہ تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اس موقع پر جلسے ہوئے، قومی اور بین الاقوامی سطح پر کانفرنسوں کا پروگرام بنایا گیا، اسکولوں، کالجوں، ادبی حلقوں اور ثقافتی انجمنوں نے مجالس منعقد کیں، رسالوں کے خاص نمبر نکالے گئے، کتابوں کی طباعت و اشاعت کا پروگرام بنایا گیا۔ غرض یہ کہ خاصا کام ہوا، اور یہ سب کچھ علامہ اقبالؒ کے نام اور کام کی برکت تھی کہ جشنِ صد سالہ کے تمام منصوبے کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔

میرا خیال پہلے بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ علامہ اقبالؒ اور ان کے فکر و فن پر کام کرنا آسان نہیں ہے۔ علم کے ایک بے پایاں سمندر کو اپنی گرفت میں کس طرح لیا جا سکتا ہے؟ بصیرت اور فراست کے ایک بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہو کر نتائج کے گہر ہائے آب دار کو نکالنا کس کے بس کی بات ہے؟ حیات اور کائنات کے ان گنت اسرار و رموز کو سمیٹنا اور ان کے بے شمار حقائق کے رُخ سے پردہ اُٹھانا کس کی دسترس میں ہے؟ اقبال کی شخصیت اور شاعری بے شمار

ایسے پہلو رکھتی ہے جس کی رسائی آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ پر کام کرتے ہوئے اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا احساس ہوتا ہے اور اس مفکرِ اعظم اور شاعرِ بلند آہنگ پر کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔

میں نے اپنی طالب علمی کے ابتدائی زمانے سے علامہ اقبالؒ کے کلام کا مطالعہ کیا اور کالج تک پہنچتے پہنچتے ان کے ساتھ دلچسپی کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ بلا مبالغہ ان کا سارا کلام مجھے ازبر ہو گیا تھا۔ لیکن ان پر کچھ لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر کسی خاص کیفیت کے زیرِ اثر یا بعض رسالوں کی فرمائش پر وقتاً فوقتاً چند مضامین لکھنے پڑے۔ یہ مضامین رسالوں میں شائع ہوتے یا مجالسِ اقبالؒ میں پڑھے گئے۔ یا پھر ان میں سے بعض صرف نوٹوں کی صورت میں محفوظ رہے۔

جشنِ اقبال کے موقع پر بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ ان مضامین کو کتابی صورت یک جا شائع کر دیا جائے۔ میں پہلے اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ لیکن جب میرے عزیز دوست، شاگرد اور رفیقِ کار ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور مکتبۂ عالیہ کے ناظم محمد جمیل النبی صاحب کسی طرح نہ مانے تو مجبوراً میں نے ان مضامین کو یک جا کر دیا اور اب یہ کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہیں۔

ان مضامین میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ علامہ اقبال کی عظیم شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں میں سے صرف چند ایک سے اپنے آپ کو آشنا کرنے کی ایک نہایت معمولی سی کوشش ہے۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے جلال و جمال تک رسائی تو خیر بڑے بڑوں کے لیے ممکن نہیں، البتہ اس خواہش کا چراغ دل میں ضرور جلایا جا سکتا ہے کہ ان کے آس پاس طواف کیا جائے۔ بس ان مضامین کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اقبال کے بارے میں تفصیل و جزئیات تو ان میں

نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف کچھ اشارے ہیں جو عالمِ کیف و مستی ہی میں رونما ہو سکتے ہیں۔ صرف چند لہریں ہیں جو عالم جذب و شوق ہی میں اُٹھ سکتی ہیں۔

اس شاعرِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اس قسم کے مضامین کی اشاعت مجھے جشن صد سالہ کے موقع پر مناسب معلوم ہوئی، اور میں اسی احساس کے پیشِ نظر ان کو مرتب کر کے شائع کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا ——— ورنہ

من آنم کہ من دانم !

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ء

احوالِ اقبال

علامہ اقبالؒ نے جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں ایران کی مابعد الطبیعات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے جو تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا، اس کے شروع میں ایک مختصر سا دیباچہ اپنے حالات اور احوال کے بارے میں لکھا تھا۔ غالباً یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کرنے کے لیے اس قسم کے تمہیدی نوٹ کا لکھنا لازمی تھا۔ پی ایچ ڈی کے لیے اس مقالے کو علامہ نے ۱۹۰۸ء میں LUZAC & CO, 46 GREAT RUSSEL STREET, LONDON. سے چھپوایا تھا، اور اس کے مطبوعہ نسخے ڈاکٹریٹ کے لیے میونخ یونیورسٹی میں پیش کیے تھے۔

اس مقالے کے ایک نسخے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں علامہ نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ علامہ LEBENSLAUF کے عنوان سے لکھتے ہیں:

" I was born on 3rd of Dhu-Qad I294 A.H.

(I876 A.D.) at Sialkot - Punjab(India).My education began with the Study of Arabic & Persian. A few years after I joined one of the local schools and began my Uniersity Career passing the first public examination of the Punjab University in I89I. In I893 I passed the MaTriculation Examination and joined the Scotch Mission College,Sialkot, where I I studied for two years, passing the Intermediate Examination of the Punjab University in I895. In I897 and I899 respectively I passed the B.A. and M.A. Examinations from the Lahore Government College. During the course of my University Career I had the good fortune to win several gold and silver medals and scholarships. After my M. A. I was appointed Mcleod Arabic Reader in the Punjab University Oriental College, where I lectured on History and Political Economy for about 3 years. I was then appointed Assistant Professor of Philosophy in the Lahore Government College. In I905 I got leave of absence for three years in order to complete my studies in Europe where I am at present residing."

"میں ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کو (۱۸۷۶ء) سیالکوٹ پنجاب میں پیدا ہوا۔
میری تعلیم عربی اور فارسی کے مطالعے سے شروع ہوئی۔ چند سال کے بعد
میں نے ایک مقامی سکول میں داخلہ لیا اور اس طرح یونیورسٹی کے امتحان
کے لیے میری تعلیم شروع ہوئی۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی کا پہلا پبلک
امتحان ۱۸۹۱ء میں پاس کیا۔ میٹریکولیشن کا امتحان میں نے ۱۸۹۳ء

میں پاس کیا اور اس کے بعد سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گیا۔ جہاں میں دو سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کالج سے میں نے پنجاب یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۱۸۹۸ء میں پاس کیا۔ میں نے ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے کا امتحان اور ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی کا امتحان گورنمنٹ کالج، لاہور سے پاس کیا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں میں اس اعتبار سے خوش قسمت رہا کہ میں نے کئی سونے اور چاندی کے تمغے اور وظائف حاصل کیے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد میرا تقرر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں بحیثیت میکلوڈ عربی ریڈر ہو گیا۔ جہاں میں نے تاریخ، سیاست اور اقتصادیات پر تقریباً تین سال تک لیکچر دیے۔ اس کے بعد مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں میں نے تین سال کی طویل رخصت لی تاکہ میں اپنی تعلیم یورپ میں مکمل کر سکوں جہاں آج کل میرا قیام ہے۔"

علامہ اقبالؒ کی یہ پہلی اور آخری اہم تحریر ہے جس میں انھوں نے اپنے حالات کا مختصر سا خاکہ تاریخوں کی تفصیل دے کر پیش کیا ہے۔ اس تحریر کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ علامہ اقبال کی خود نوشت ہے اور اس سے ان کی ولادت، وطن، امتحانات پاس کرنے اور ملازمتوں وغیرہ کی صحیح تاریخیں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی علمی اور تعلیمی زندگی میں وہ جن منصوبوں پر فائز رہے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے جو منزلیں طے کی ہیں ان کا علم بھی ہو جاتا ہے۔

اس تحریر کو دیکھنے کے بعد وہ تاریخیں غلط ثابت ہو جاتی ہیں جو بعض لکھنے والوں نے ان کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھی ہیں۔ مثلاً عام طور پر ان کی تاریخ

ولادت ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ یعنی ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بتائی جاتی ہے۔ لیکن علامہ نے خود جو تاریخیں اپنے خود نوشت دیباچے میں دی ہیں ان کے سامنے دوسرے لوگوں کی دی ہوئی تاریخوں کی کوئی تحقیقی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ جیساکہ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے کے دیباچے میں لکھا ہے وہ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ یعنی ۱۸۷۴ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا خاندان تھا۔ ان کے آباؤ اجداد سترھویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ علامہ کا خاندان ایک زمانے تک سری نگر میں آباد رہا لیکن ہندو راجہ کے ناقابلِ برداشت ظلم و ستم کی وجہ سے ان کے جدِ اعلیٰ ۱۸۹۷ء میں سری نگر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آگئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ مشہور یہ ہے کہ ان کے جدِ اعلیٰ نے ایک سید بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کا اسلامی نام محمد صالح رکھا گیا۔ ۱۸۹۷ء کے بعد علامہ کے ایک بزرگ کشمیر کے ہندو راجہ کے مظالم سے تنگ آکر سری نگر کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے ہجرت کی اور سیالکوٹ کو اپنا وطن بنالیا۔ علامہ اقبالؒ کے دادا کا نام شیخ محمد رفیق تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ شیخ نور محمد اور شیخ غلام قادر۔ شیخ نور محمد علامہ کے والد محترم تھے اور ان کی والدہ محترمہ کا نام امام بی بی تھا۔ شیخ نور محمد نہایت نیک اور صالح بزرگ تھے۔ انھیں تصوف سے گہری دلچسپی تھی۔ اور وہ اسلامی تصوف کے معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ علامہ کی والدہ محترمہ بھی نہایت نیک خاتون تھیں اور عبادت اور ریاضت میں اپنا بیشتر وقت صرف کرتی تھیں۔

شیخ نور محمد کے دو صاحب زادے تھے۔ شیخ عطا محمد اور شیخ محمد اقبال۔ ان کے علاوہ تین بیٹیاں تھیں۔ علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی تعلیم زیادہ نہ ہو سکی۔ انھوں نے نوجوانی ہی میں ملازمت کر لی اور علامہ اقبال کی تعلیم پر بہت توجہ دی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں یورپ بھی بھیجا۔ حضرت علامہ کے دل میں اپنے برادر بزرگ کا بڑا احترام تھا اور

وہ ان کے شیفتہ تھے۔

علامہ اقبالؒ نے سیالکوٹ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مولانا سید میر حسن کا مدرسہ اس زمانے میں سیالکوٹ میں عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے مشہور تھا۔ علامہ اقبال نے عربی اور فارسی انہی مولانا میر حسن سے پڑھی اور مولانا کی شخصیت کے اثرات ان پر بڑے گہرے ہوئے۔ علامہ اقبال ابتدا ہی سے بہت ذہین تھے۔ چنانچہ اس ذہانت نے محنت کے ساتھ مل کر انھیں مولانا میر حسن کا ایک نہایت اہم شاگرد بنا دیا۔ انھیں ابتدا ہی سے دینی معاملات سے لگاؤ اور شعر و ادب کا شوق تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ مولانا میر حسنؒ کی تعلیم کے اثر سے نکھرتا گیا۔

مولانا میر حسن سے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ سکاچ مشن ہائی سکول، سیالکوٹ میں داخل ہوئے، اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے بیان کے مطابق، انھوں نے ۱۸۹۰ء میں مڈل اور ۱۸۹۲ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور انھیں یونیورسٹی کی طرف سے ان کی نمایاں کامیابی پر وظیفے دیے گئے۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ کالج میں داخل ہوئے اور وہاں سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحان پاس کیے اور بالآخر گورنمنٹ کالج لاہور آئے اعلا انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین لے کر ۱۸۹۷ء میں انھوں نے بی اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ان کی اس نمایاں کامیابی پر انھیں سونے کے دو تمغے یونیورسٹی کی طرف سے دیے گئے۔ یہیں گورنمنٹ کالج میں ان کی ملاقات پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی جو فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ علامہ اقبالؒ کو بھی فلسفے کے مضمون سے دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ پروفیسر آرنلڈ سے زیادہ قریب ہوئے۔ اور ان کی شفقت کا علامہ اقبال پر بہت اچھا اثر ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں استاد اور شاگرد کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ چنانچہ آرنلڈ ہی کا یہ اثر تھا کہ انھوں نے ایم۔ اے کی تعلیم کے لیے فلسفہ

کا مضمون منتخب کیا اور ۱۸۹۹ء میں یونیورسٹی کے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

علامہ اقبالؒ نے شاعری تو سیالکوٹ ہی میں شروع کر دی تھی اور شروع شروع مرزا داغؔ سے اصلاح لی تھی۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا لیکن جب داغؔ نے یہ لکھا کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں تو وہ باقاعدہ شاعری کرنے لگے اور بہت تھوڑے عرصے میں ان کی شہرت نہ صرف لاہور بلکہ سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس زمانے میں علامہ مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھتے تھے اور داد وصول کرتے تھے۔ شروع ہی سے ان کی غزل میں ایک فکری رجحان کی جھلک نظر آتی تھی۔ اور یہ اردو غزل میں ایک نیا رجحان تھا۔ جس کو انھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ اہم بنا دیا۔ اسی زمانے میں ان کی شاعری کے فکری رُجحان کی وجہ سے قومی انجمنوں نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی نظمیں جلسوں میں پڑھیں۔ چنانچہ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں انھوں نے اپنی قومی اور ملّی نظمیں پڑھیں۔ ۱۸۹۹ء سے اس کا آغاز ہوا۔ جب انھوں نے اپنی نظم "نالۂ یتیم" انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھی تو حاضرین کا اس پر بڑا گہرا اثر ہوا اور ملّی شاعر کی حیثیت سے اقبال کی شہرت سارے برعظیم میں پھیل گئی۔

گورنمنٹ کالج سے فارغ ہونے کے بعد وہ ۱۹۰۲ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربی ریڈر مقرر ہوئے اور یہاں انھوں نے تدریس کے ساتھ ساتھ علمی کام بھی کیا۔ چنانچہ ان کی پہلی باقاعدہ تصنیف "علم الاقتصاد" یونیورسٹی اورینٹل کالج کے دورانِ قیام میں لکھی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں وہ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ لیکن یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ان کا تعلق بہرحال رہا کیونکہ اس زمانے میں بعض مضامین ایسے تھے جن کی تعلیم گورنمنٹ کالج کی بجائے اورینٹل کالج میں ہوتی تھی۔ اور علامہ اقبال ان مضامین پر لیکچر دینے کے لیے اورینٹل آیا کرتے تھے۔

سر شیخ عبدالقادر کا مشہور ادبی رسالہ "مخزن" ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبالؒ لاہور میں تدریس و تحقیق کے کام میں مصروف تھے اور ان کے ادبی مشاغل کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سر عبدالقادر بڑے جوہر شناس شخص تھے۔ چنانچہ انھوں نے علامہ کی شخصیت میں ادبی لحاظ سے ایک جوہر قابل کو تلاش کیا اور انھیں مخزن میں مضامین اور نظمیں لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ کئی سال تک یہ نظمیں اور مضامین مخزن میں شائع ہوتے رہے۔ اور بقول "سر شیخ عبدالقادر ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک جب اقبال ولایت گئے ان کی نظموں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں وہ عموماً مخزن کے ہر نمبر کے لیے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے اور جوں جوں لوگوں کو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوتا گیا جابجا مختلف رسالوں اور اخباروں سے فرمائش آنے لگی اور انجمنیں بھی فرمائشیں کرنے لگیں۔ اور وہ اسی طرح لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ کرنے لگے۔ ولایت جانے سے قبل ہی اقبال کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے میں قیام پذیر تھے اور ان کا مکان ایک اچھا خاصا علمی اور ادبی مرکز بن گیا تھا۔

۱۹۰۵ء میں علامہ اقبالؒ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے اور انگلستان پہنچ کر ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں علامہ اقبالؒ کے پرانے استاد پروفیسر آرنلڈ بھی موجود تھے۔ انھوں نے ان سے بھی علمی استفادہ کیا اور فلسفہ کے پروفیسر، پروفیسر میکٹیگرٹ سے بھی بہت قریب رہے۔ اس زمانے میں ان کا رابطہ پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن سے بھی رہا۔ انھوں نے کیمبرج کے دورانِ قیام میں عربی، فارسی کے علاوہ تصوّف اور خاص طور پر اسلامی فلسفے کا مطالعہ کیا۔ پی ایچ ڈی کے لیے انھوں نے، اسی زمانے میں مابعد الطبیعات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ چنانچہ ایران کی مابعد الطبعیات پر انھوں نے تحقیقی مقالہ لکھا جس کو میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا۔ اس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ اس مقالے کی تیاری میں انھوں نے برلن، میونخ اور ہائیڈل برگ میں بھی قیام کیا

اور وہاں کے علمی ماحول سے وہ خاصے متاثر ہوئے۔

علامہ اقبالؒ کا قیام انگلستان اور پھر قیام جرمنی اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اسلامی فلسفے، تصوف اور تاریخ کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا اور عربی فارسی اور کسی حد تک سنسکرت زبانوں کی طرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ ان کی شخصیت میں علمی اعتبار سے ایسی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی جس نے انھیں اپنے زمانے کی ایک اہم شخصیت بنا دیا۔ اس زمانے میں علامہ اقبال نے باقاعدگی سے مغربی مفکرین کا مطالعہ کیا لیکن مشرقی اور خصوصاً اسلامی مفکرین بھی ان کے پیش نظر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ اقبال مغرب سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ مغربی تہذیب اور فکر کو تجزیاتی نظر سے دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ مغربی فکر سے انسانیت کی نجات پوری طرح ممکن نہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سر شیخ عبدالقادر بھی لندن میں موجود تھے۔ عطیہ بیگم کا قیام بھی لندن میں تھا اور ان دونوں شخصیتوں سے علامہ اقبال کا گہرا رابطہ رہا۔ خصوصاً سر شیخ عبدالقادر نے اس زمانے میں ادب شعر اور فلسفہ پر کام کرنے کا ایک ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ علامہ اقبالؒ ان کے اس ماحول سے بھی متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی پروفیسر سلینی شال نے بھی علامہ اقبال کی رہنمائی کی اور ایک استاد کی حیثیت سے اس محترم خاتون نے بھی ان کے مزاج پر اثر کیا۔ اس زمانے کے جو واقعات مختلف لکھنے والوں نے جمع کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ یورپ میں فلسفہ اور شعر و ادب کا مطالعہ ہی نہیں کر رہے تھے ان کی شخصیت پر محسب طرح کے اثرات ہو رہے تھے۔ روحانیت کی طرف ان کا رجحان بہت بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ عالم استغراق میں جا پہنچتے تھے۔ گویا اسلامی فکر اور تصوف کی عملی صورت ان کی شخصیت میں رونما ہو رہی تھی۔

اسی زمانے میں علامہ اقبال اس نتیجہ پر بھی پہنچے کہ وطنیت کے تصور سے انسانی

معاشروں میں ایک بڑا فساد پیدا ہوتا رہا ہے۔ اس لیے ایک عالم گیر انسانی برادری کا تصور عام ہونا چاہیے، تاکہ وطنیت کے تصوّر سے جو کینہ پیدا ہوتا ہے، اس کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی ہو جائے۔ اس کے لیے انھوں نے اسلام کا راستہ اختیار کیا کیونکہ اسلام ایک ایسا دین اور مذہب تھا جو انسانیت کو اس عالمگیر برادری کی لڑی میں پرونے کی بے پایاں صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی حالت اور اسلام کی کیفیت علامہ پر واضح تھی کیونکہ انھوں نے اسلامی تاریخ اور فکر کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس لیے وہ یہ سوچنے لگے کہ مسلمانوں کو اخلاقی اعتبار سے بلند ہونا چاہیے۔ علم اور فکر کی دولت ان کے لیے لازمی ہے اور عمل کی دنیا میں انھیں قدم آگے بڑھانے چاہییں تاکہ ان کا عمل انسانیت کے زخموں کے لیے مرہم ثابت ہو۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے علّامہ نے قیامِ یورپ کے زمانے میں اپنی نظم و نثر دونوں کے ذریعہ اپنے ان خیالات اور نظریات کو پیش کیا، اور ان خیالات و نظریات کے گہرے اثرات ہوئے۔

علّامہ اقبال تین سال یورپ میں قیام کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء میں وطن واپس پہنچے۔ اب ان کی شخصیت میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ انھوں نے لاہور میں قیام کیا — بیرسٹری کو پیشہ بنایا اور علمی کاموں میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں بیرسٹری کے ساتھ ساتھ کچھ عرصے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے بھی عارضی طور پر کام کیا۔ سر شیخ عبدالقادر بھی اب واپس لاہور آ گئے تھے۔ اور یہاں بھی علّامہ اقبال سے ان کی ملاقات رہتی تھی، علامہ نے خود لکھا ہے کہ "میں عبدالقادر سے اکثر ملتا ہوں اور چیف کورٹ کے بار روم میں تو ان سے روزانہ ملاقات ہو جاتی ہے۔" ان دنوں سر شیخ عبدالقادر کی وجہ سے لاہور میں اردو اب کا بہت چرچا تھا۔ علامہ اقبال بھی ان کے ساتھ اردو ادب کو نئے رجحانات سے ہم کنار کرنے میں پیش پیش رہے۔ انجمن حمایت اسلام کے ساتھ بھی ان کا اس زمانے میں گہرا

تعلق رہا اور نہ صرف اس کے سالانہ جلسوں میں انھوں نے اپنی قومی و ملی نظمیں پڑھیں بلکہ مسلمانوں کی ایک اہم معاشرتی اور تعلیمی انجمن کی حیثیت سے اس کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں بھی علامہ اقبالؒ نے خاصا کام کیا۔ یہ زمانہ ان کی اُردو اور فارسی شاعری کے لیے بہترین زمانہ ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں انھوں نے اسرارِ خودی لکھی رموزِ بے خودی اور پس چہ باید کرد کی تخلیق کی اور جاوید نامہ، زبورِ عجم اور پیامِ مشرق کے ایسے اہم مجموعے مرتب کر کے شائع کیے۔ اُردو میں بالِ جبریل اور ضربِ کلیم بھی اسی زمانے میں مرتب ہو کر شایع ہوئیں۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سال علامہ اقبال کی شاعری میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے کی شاعری میں ملی تصورات غالب ہیں۔ اور ان کے زیرِ اثر انھوں نے اسلامی نظام، عالمِ اسلام کی برتری اور انسانیت کے فروغ کے لیے نظمِ دنشر کی تخلیق کی ہے۔ بین الاسلامیت کے تصور کا اثر ان پر اس زمانے میں گہرے سے گہرا ہوتا گیا ہے۔ فکری اعتبار سے وہ اسلامی تصوف سے بھی بہت قریب رہے ہیں اور اگرچہ اس کے بعض پہلوؤں سے انھوں نے اختلاف کیا ہے لیکن مجموعی طور پر وہ اسلامی تصوف کے علمبرداروں کو بڑی اہمیت دیتے رہے کیونکہ ان سب کے پیشِ نظر اسلامی اقدار کا فروغ اور انسانیت کی برتری کا خیال تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے آس پاس کا زمانہ اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں بڑے ہیجان اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ان پر انگریزوں کی طرف سے خاصے ظلم و ستم ہوئے جنگ ختم ہوئی تو انھیں رولٹ ایکٹ اور مارشل لا سے دوچار ہونا پڑا اور ادھر یورپ میں سلطنتِ عثمانیہ کا آفتاب غروب ہو گیا۔ اور بقول اقبال "فریبِ غربیاں کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی یک جہتی پارہ پارہ ہو گئی۔ خلافت کی عمارت گر گئی اور مسلمان بے یار و مددگار ساری دنیا میں پریشان حال نظر آنے لگے۔ علامہ ان حالات

سے بہت متاثر ہوئے اور اس زمانے میں انھوں نے جو شاعری کی وہ اسی صورت حال کا مرثیہ ہے۔ شاید اسی صورت حال کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ مل کر کام کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ترکِ موالات کی تحریک وغیرہ میں مسلمان بھی شریک ہوتے۔ مولانا محمد علی جوہر اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ خلافت کی پوری تحریک انہی کی شعلہ بیانی کے اثر سے فروغ پاتی رہی۔ علامہ اقبال نے اس ہنگامہ آرائی سے تو کوئی دلچسپی نہیں لی جو ان سیاسی حالات کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ لیکن ان کی نظموں، خضر راہ، اور طلوعِ اسلام سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مسلمانوں کا بڑا درد تھا۔ اور وہ ان کی حالتِ زار پر خون کے آنسو بہانے کے ساتھ اسلام کی بلندی اور انسانیت کی برتری کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں نے اس زمانے میں انھیں سر کا خطاب بھی دیا اور ہر طرح ان کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ اقبال ایک اور ہی راستے پر گامزن تھے۔ ان کے سامنے تو مغرب کے وہ تمام ظلم و ستم تھے جو وہ مشرق پر ڈھا رہے تھے۔ چنانچہ اس کا اثر ان کی نظموں اور غزلوں پر زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ ۱۹۲۳ میں انھوں نے پیامِ مشرق شائع کی جس میں مغرب اور مشرق کی کشمکش پر ان کے خیالات بہت واضح تھے۔ یہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا احساس ہی تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اس زمانے میں خاصی حد تک عملی سیاست میں حصہ بھی لیا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ ظاہر ہے کہ انھیں وزیر بننے یا ممبر بننے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس میدان میں آنے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے عملی زندگی میں بہتر صورتیں پیدا کر سکیں۔ چنانچہ عملی سیاست میں حصہ لینے کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور وہ مختلف کانفرنسوں وغیرہ میں شرکت کر کے اپنے خیالات اسلامیانِ ہند کی سیاست کے بارے میں ظاہر کرتے رہے۔ لیکن

ہندوؤں کے سیاسی رویوں نے انھیں بہت بددل کیا اور انھوں نے اسلامیان ہند کی نجات اس میں دیکھی کہ وہ ہندوستانی سیاست میں اپنی ایک علیٰحدہ وحدت کو قائم رکھیں۔ چنانچہ ۱۹۳۰ میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد سیشن میں انھوں نے جو خطبہ پڑھا اس میں واضح طور پر انھوں نے یہ بات کہہ دی کہ اسلامیان ہند کی نجات صرف اس میں ہے کہ ان کے پاس ایک علیٰحدہ وطن ہو۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں۔ اس کا اثر مسلمانوں کی سیاست پر بڑا گہرا ہوا اور اس کے بعد مسلمان رفتہ رفتہ ایک مرکز پر جمع ہوتے گئے اور اگرچہ علامہ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا، لیکن ان کے افکار و خیالات اس طرح پھیلے کہ ۱۹۴۰ء میں یعنی ان کے انتقال کے دو سال بعد قیام پاکستان کی قرارداد لاہور میں منظور کی گئی اور اس کے لیے قائدِ اعظم کی قیادت میں اسلامیان ہند نے قیام پاکستان کی جدوجہد شروع کی اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ اور اس طرح علامہ اقبالؒ کے خیال نے حقیقت کی صورت اختیار کر لی۔

۱۹۳۸ء میں علامہ اقبالؒ بظاہر ہم سے رخصت ہو گئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمارے درمیان آج بھی موجود ہیں، ان کے افکار و خیالات نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالم اسلام کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اسلام اور پاکستان کے مفکرؔ ہیں اور انھوں نے اپنی فکر سے پاکستان کو وجود میں لانے اور عالم اسلام کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو اسلام، پاکستان اور انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ انھوں نے اپنی عظیم مفکرانہ شاعری سے عالم اسلام کو بیدار کیا، مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑائی، اور اسلامی نظام اقدار کی اہمیت کے احساس کو افراد کے دلوں میں اتارا اور انسان اور انسانیت کی برتری کے جو خواب وہ زندگی

بھر دیکھتے رہے تھے ان کو انھوں نے اپنے فکر و شعور سے۔ ایک عملی شکل دینے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے دورِ جدید میں کوئی اور مفکر و شاعر ان کی عظیم شخصیت کے سامنے نہیں ٹھہرتا۔

علّامہ اقبال کے حالات اور احوال و افکار میں بڑی جذب و کشش ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ ایک مردِ قلندر کی حیاتِ جاوداں کی روداد لطیف ہے۔ اس میں نظریے کی پختگی، عمل کی باقاعدگی، عزم و ہمت کی بلندی، محبت و خدمت کی بلند آہنگی کے ایسے رجحانات ملتے ہیں جو ایک عظیم شخصیت کے ترجمان اور عکاس اور اس کی عظمت کے آئینہ دار ہیں۔

افکارِ اقبال

علّامہ اقبال ہمارے قومی و ملّی شاعر تھے۔ انھوں نے ہمیں اسلام اور پاکستان کے صحیح تصوّر سے آشنا کیا اور اپنی ساری زندگی اسلام، اسلامی افکار و نظریات کی اشاعت اور مسلمانانِ برعظیم پاکستان و ہند کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی۔ وہ اسلام کے فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ انھوں نے تمام دنیا کے فلسفیوں کا مطالعہ کر کے نہایت گہرائی اور بصیرت کے ساتھ اسلام کے نظریات کو پیش کیا اور اس کے اثرات ہماری قوم اور قومی اور ملّی زندگی پر بڑے گہرے اور ہمہ گیر ہوئے۔

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے علامہ اقبال کا کلام جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے ہر گھر میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ بیشمار لوگ ایسے تھے جنھیں علّامہ کا پورا کلام ازبر تھا۔ بچے اور بڑے گھر گھر ترنم کے ساتھ ان کے کلام کو پڑھتے اور اپنی، اپنے خاندان، اور اپنی قوم و ملّت کی رُوح کو بالیدہ کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام نے مسلمانوں میں اسلام کے ساتھ محبّت پیدا کی۔ عشقِ رسول سے انھیں سرشار کیا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اسلام کی سربلندی کے لیے صحیح حالات پیدا کیے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات نے

مسلمانوں اور خصوصاً اس برعظیم کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک قوم ہونے احساس پیدا کیا جو بالآخر قیام پاکستان کی تحریک کی بنیاد بنا۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں اسلامیانِ ہند کے لیے ایک علیٰحدہ وطن کا تصور پیش کر دیا تھا۔ اس کو بنیاد بنا کر قیام پاکستان کے لیے سیاسی تحریک چلائی گئی اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں ہمیں وہ وطن ملا جس کی وجہ سے آج ہم دنیا میں ایک آزاد اور باوقار انسان کی طرح سر اٹھا کر چل سکتے ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری میں تنوع اور ہمہ گیری ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مغنّی ہیں۔ ان کے ہاں انسان کی عظمت اور انسانیت کی برتری کا بڑا گہرا شعور ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری نے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے فکر و فلسفہ کا بنیادی موضوع یہی معاملات ہیں۔ ان کے ہاں خودی کا جو تصور ملتا ہے۔ تسخیر فطرت کے جو خیالات نظر آتے ہیں، مردِ مومن اور انسان کامل کی جو تصویریں دکھائی دیتی ہیں، ان سب کی تہہ میں بہ حیثیت انسان مسلمانوں کی سربلندی کا خیال کار فرما ہے۔ وہ انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ عظمت انسانی کے قائل ہیں۔ انھیں انسان کے عظیم منصب کا احساس ہے۔ زندگی اس انسان سے جو تقاضا کرتی ہے اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں انسان اور انسانیت کے بنیادی معاملات کی ترجمانی اور عکاسی ملتی ہے۔

عظمت اور فضیلت انسانی علامہ اقبال کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ وہ انسان کو ستاروں پر کمند ڈالتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ ستاروں سے آگے جو جہاں ہیں، ان تک رسائی حاصل کرے۔ چنانچہ اپنی شاعری میں انھوں نے جگہ جگہ اس انسان کی عظمت کے تصورات کو پیش کیا ہے اور اس کی جدوجہد اور کامیابی و کامرانی کے نغمے گائے ہیں۔ وہ انسان کو فرشتوں سے بھی زیادہ عظیم سمجھتے ہیں اور زندگی میں خیر کی ترجمانی ان کے خیال میں انسان ہی کر سکتا ہے۔

مردِ مومن کا تصور جو اقبالؒ کے ہاں ملتا ہے، وہ درحقیقت اسی انسان کا تصور ہے۔ یہ انسان کامل یا مردِ مومن اس دنیا میں نیابت الٰہی کا مرتبہ رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے خیال میں اس کے زور بازو کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ وہ محبت پر ایمان رکھتا ہے۔ جدوجہد اور کوشش پیہم کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور انسانی زندگی کو سنوارنے کا عظیم کام انجام دیتا ہے۔ بلاشبہ اس کی عظمت کا راز حیات و کائنات کی اسی مشاطگی میں مضمر ہے۔

اس انسان اور مردِ مومن کا جو تصوّر علّامہ اقبالؒ نے پیش کیا ہے، وہ ایک صحیح اور سچّے مسلمان کا تصوّر ہے۔ ان کے خیال میں انسانیت کی نجات اسلام کے صحیح اصولوں کو سمجھنے اور ان کے برتنے میں ہے۔ ان اصولوں کی عملی صورت کے بغیر زندگی ویران اور انسانیت تباہ حال رہے گی۔ اسلام ان کے خیال میں ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ وہ ایک ایسا نظام ہے جس میں انسانی قدروں کو فروغ ہوتا ہے، انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جذب و شوق کی مشعلوں کو ہاتھ میں لے کر زندگی کے راستے پر ایک ایسی منزل کی طرف آگے بڑھتا ہے جہاں زندگی نکھری اور دھلی ہوئی نظر آتی ہے اور اس میں حد نظر تک پاکیزگی اور تقدس کا احساس ہوتا ہے اور جہاں محبت اور خدمت، عبادت اور ریاضت کی حکمرانی ہوتی ہے۔

علّامہ اقبالؒ کے پاس ایک دردمند دل تھا۔ وہ انسان کو پریشان حال اور انسانیت کو پامال نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے مساوات کا سبق پڑھایا۔ طبقاتی تفریق کو مٹا کر عام انسانوں کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کا خواب دیکھا۔ ان کے ہاں انقلاب کا جو تصور ملتا ہے، تبدیلی کی جو خواہش نظر آتی ہے، وہ بھی درحقیقت انسان اور انسانیت کو بلند کرنے کی آرزو

کا نتیجہ ہے۔

یہ عالمِ آب و گِل اس وقت ایک ایسے انتشار سے دوچار ہے جس میں انسانوں کا جینا دوبھر ہوگیا ہے۔ دور دور تک ایک عرصۂ محشر کا سا سماں ہے اور ایسی گھٹن ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ ہر فرد اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی پریشانی کے عالم میں پڑا تڑپ رہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری انسانیت زخموں سے چور ہے۔ علامہ اقبالؒ کے افکار و خیالات انسان اور انسانیت کے ان زخموں کے لیے ایک ایسا مرہم ہیں جو انھیں مندمل کر کے ایک نئی زندگی سے ہمکنار کرنے کی بے پایاں صلاحیت رکھتے ہیں۔

کلامِ اقبالؒ کے مندرجۂ ذیل اقتباسات سے اُن کے خیالات و نظریات اور اُن افکارِ عالیہ کا پُورا پُور نقشہ سامنے آجاتا ہے:

محبت کے شرر سے دل سراپا نُور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طُور ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا
شرابِ بے خودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا
تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آب جو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بے گانہ خو! رہنا

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اُس نے مجھکو مستِ بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

(تصویرِ درد)

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

سنایا ہند میں آکر سرودِ ربّانی
پسند کی کبھی یونان کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطّۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے

بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دوربیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو، برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

(سرگزشتِ آدم)

○

محفلِ قدرت ہے، اک دریائے بے پایانِ حُسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن

حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضو گستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے

آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ

عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں

ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حُسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حُسن

رُوح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

حُسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

(بچہ اور شمع)

○

○

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا، چلنا، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکون، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب — تارے، انسان، شجر، حجر، سب

ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا ؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا ؟

کہنے لگا چاند ہم نشینو ! — اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو !
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑ تا شہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں ! — جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حُسن
آغاز ہے عشق، انتہا حُسن

○ (چاند اور تارے)

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے — مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
ہیں ہزاروں اس کے پہلو، رنگ ہر پہلو کا اور — سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں
دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز — کیا خبر تجھکو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے — مضطرب ہوں، دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں
گو حسیں تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر — حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

بے نیازی بھی ہے پیدا مری فطرت کا نیاز — سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں

(عاشقِ ہرجائی)

○

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے!

انساں کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا

بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا

حیرت آغاز و انتہا ہے

آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟

ہے گرمِ خرام موجِ دریا — دریا سوئے بحر جادہ پیما

بادل کو ہوا اڑا رہی ہے — شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے

تارے مستِ شرابِ تقدیر — زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر

خورشید، وہ عابدِ سحر خیز — لانے والا پیامِ "برخیز"

مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کے — پیتا ہے مئے شفق کا ساغر

لذت گیرِ وجود ہر شے — سرمستِ مئے نمود ہر شے

کوئی نہیں غم گسارِ انساں!

کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

(انسان)

○

جھلکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر — فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل — عدم عدم ہے، کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

(ستارہ)

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

اس زیاں خانے میں کوئی ملّتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا ہے بے اعتنائی سے یہ منظر جہاں

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ جدّت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو!

○

(گورستانِ شاہی)

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

○

(وطن)

حُسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزار ہا انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

(بزمِ انجم)

○

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقان! ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو!
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آ کر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی!
قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو
بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!

(شمع اور شاعر)

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور — خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!

(پیوستہ رہ شجر سے ...)

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات !
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات !
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات !
ساحرِ اَلْمُوْطْ نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بےخبر سمجھا اسے شاخِ نبات !
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے،
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے !

(خضرِ راہ)

○

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں،
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں !

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری،
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبّت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے!

(طلوعِ اسلام)

○

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی ؛
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی !

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے!
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے !
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے!
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

○ (طلوعِ اسلام)

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

○ (لینن خدا کے حضور میں)

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیر و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

○ (فرشتوں کا گیت)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

○ (فرمانِ خدا)

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاشِ رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

دلِ طور و سینا و فاران دو نیم — تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم

(ساقی نامہ)

○

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

(ساقی نامہ)

○

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیدارئ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

(ساقی نامہ)

○

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں کبھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

(فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں)

○

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہ رسا دیکھ
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

(روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے)

○

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

○ (لا الٰہ الا اللہ)

اقبال کا تنقیدی نقطہ نظر

گوئٹے نے ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ایک اچھے شاعر کے لیے نقاد ہونا بھی ضروری ہے۔ عظیم شاعری بغیر ایک واضح تنقیدی نقطۂ نظر کے ناممکن ہے۔ اقبالؔ ایک عظیم شاعر ہیں اس لیے ان کے پاس ایک واضح تنقیدی نقطۂ نظر ہے۔ اور چونکہ ان کے پاس ایک واضح تنقیدی نقطۂ نظر ہے اس لیے وہ ایک عظیم شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شخصیت میں شاعری اور تنقید کو یک جا کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے فن میں ان دونوں کا بڑا حسین سنگم بنایا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری کے تنقید اور تنقید کے شاعری ہونے کا احساس سب سے پہلے ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں تنقید ہے اور تنقید میں شاعری!

اقبالؔ نے تنقیدیں نہیں لکھی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک نقاد ہیں۔ انھوں نے فن کی تنقید کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے پاس ایک واضح تنقیدی نقطۂ نظر ہے اور اسی میں ان کی بڑائی ہے کہ وہ تنقیدیں نہ لکھنے کے باوجود ایک نقاد ہیں اور فن تنقید کی طرف باقاعدگی سے توجہ نہ کرنے کے باوصف ایک واضح تنقیدی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ یوں ایک تنقیدی نقطۂ نظر

تو کم و بیش ہر شاعر کے پاس ہوتا ہے۔ شعر کی تخلیق کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ اصول اس کے پیشِ نظر رہتے ہیں، بعض معیاروں کو وہ سامنے رکھتا ہے چند قدریں اس کے پاس ہوتی ہیں۔ اسی کو شاعر کے نقطۂ نظر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اقبالؔ کے پاس بھی شاعری کے کچھ نہ کچھ اصول ہیں، کچھ نہ کچھ معیار ہیں، کچھ نہ کچھ قدریں ہیں۔ لیکن یہی ان کے نقاد ہونے اور تنقیدی نقطہ نظر رکھنے کی دلیل نہیں ہے۔ دلیل تو یہ ہے کہ انھوں نے ان اصولوں، معیاروں اور قدروں کی اہمیت ذہن نشین بھی کرائی ہے۔ ان کی نوعیت کو واضح بھی کیا ہے۔ ان کے نشیب و فراز پر بحث بھی کی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ نظموں میں ہے۔ اسی لیے لوگ انھیں صرف شاعر سمجھتے ہیں اور ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ انھیں نظموں میں انھوں نے بعض تنقیدی خیالات ایسے مفکرانہ انداز میں پیش کیے جن میں سے ایک واضح تنقیدی نقطۂ نظر ابھرتا ہے۔

یہ تنقیدی نقطۂ نظر اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ مخصوص حالات اس کو پیش کرنے کے محرک ہوئے ہیں۔ یہ نیا ضرور ہے لیکن اردو کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ اس میں جدت اور انچ ہے، گہرائی اور گیرائی ہے، بلندی اور وسعت ہے۔ کیونکہ اس کی رگوں میں فکر کا خون ہے اور اس خون میں عقیدے کی گرمی ہے۔ اس اعتبار سے وہ اپنے پیش رو تنقیدی نظریات کے مقابلے میں بالکل اچھوتا ہے، لیکن ان سے الگ نہیں ہے۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ ان نظریات کا ایک تسلسل نظر آتا ہے جو اس سے قبل اردو تنقید میں پیش کیے جاتے رہے تھے۔ اقبالؒ سے قبل اردو تنقید میں حالیؒ کی عظیم شخصیت ملتی ہے۔ حالیؒ نے جو تنقیدی نقطہ نظر پیش کیا تھا، اقبالؔ کا نقطہ نظر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان کی شخصیت اور فن دونوں میں حالیؒ کی شخصیت اور ان کے شعور کی آوازیں جگہ جگہ سنائی دیتی ہیں۔ حالیؒ نے ایک سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اقبال نے آگے چل کر اس پر تنقید نقطہ نظر کی ایک ایسی عظیم اور شاندار عمارت تعمیر کی جو اپنی مثال آپ ہے۔ حالی نے جو کچھ اقبال سے

قبل کہا وہ اپنے مخصوص حالات میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اقبالؒ نے اس پر جو اضافہ کیا ہے وہ ان کی جدّت نہیں ہے۔ بلکہ اس کام کی تکمیل ہے جس کا آغاز حالی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ حالی ایک فن کار اور نقاد تھے لیکن مفکر اور فلسفی نہیں تھے۔ اقبال فن کار اور نقاد ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مفکر اور فلسفی بھی۔ بلکہ فن کار اور نقاد ہیں اس لیے فلسفی ہیں اور فلسفی ہیں اس لیے فنکار اور نقاد ہیں۔

بس یہی حالیؔ اور اقبالؔ میں بنیادی فرق ہے۔ اقبال نے حالی کے خیالات پر فلسفے کا اضافہ کیا ہے۔ اسی لیے ان کے تنقیدی نقطہ نظر میں ایک فلسفیانہ رنگ و آہنگ ہے۔ اسی فلسفیانہ رنگ و آہنگ نے اس میں ایک انفرادیت پیدا کی ہے۔ ایسی انفرادیت جس میں عظمت بھی ہے اور ترفع بھی!

حالی کا تنقیدی نقطۂ نظر ایک بہت بڑا تجربہ تھا۔ جس نے اُردو تنقید میں ایک عظیم روایت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس عظیم روایت میں بنیادی حیثیت ان خیالات کو حاصل تھی کہ ہر خیال مادے سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب کوئی اضطراری فعل نہیں ہے۔ وہ ایک تخلیقی عمل ہے لیکن اس کی نوعیت سماجی اور تہذیبی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے اندر ایک افادیت اور مقصدیت بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ خود سماجی زندگی میں افادیت اور مقصدیت ہی سب کچھ ہے۔ اس طرح ادب، حالی کے نزدیک قوم اور ملک کو سنوارنے اور راہِ راست پر چلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور اس کام کو وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ کم و بیش اسی طرح کے خیالات حالی کی تنقیدی فکر کے بنیادی محور ہیں۔ حالی کے اس تنقیدی نقطہ نظر نے اُردو تنقید کی اس روایت کو متزلزل کر دیا جس میں ادب ایک صنعت گری کا نام تھا اور جس کا مقصد اگر کوئی تھا تو صرف ذہنی تعیش!

اقبالؔ جہاں تک ان کے تنقیدی نقطہ نظر کا تعلق ہے، اگرچہ حالی کے ہم آواز نظر آتے ہیں اور ان کے بنیادی خیالات بھی کم و بیش یہی ہیں لیکن چونکہ وہ ان کی فکر سے قریبی تعلق

اور ان کے فلسفے سے گہرا ربط رکھتے ہیں، اس لیے ان کا تنقیدی نقطہ نظر اسی فکر اور فلسفے کا ایک بنیادی جزو معلوم ہونے لگتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہے بھی اس کا ایک بنیادی جزو۔ اس لیے اقبالؒ کے فکر و فلسفہ کے بنیادی اصول کی روشنی میں اس کے خدوخال واضح ہو سکتے ہیں۔

فلسفیانہ موشگافیوں سے اگر قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو فکرِ اقبال صرف چند مابعد الطبیعاتی یا تمدنی اور عمرانی اصطلاحات کا مجموعہ ہی نہیں رہ جاتی بلکہ زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا ایک لائحہ عمل بن جاتی ہے۔ اقبال کی فکر نرا فلسفہ نہیں ہے۔ فلسفے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اسی لیے اس کی بنیادیں کسی نہ کسی مقصد پر استوار نظر آتی ہیں۔ اقبالؒ نے فلسفے کو مقصدیت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ان کے فلسفے کا ایک مقصد ہے بلکہ اسی مقصد کو انھوں نے فلسفہ بنا دیا ہے۔ بہرحال ان کے فلسفے کا بنیادی نچوڑ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی عظمت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ انسانی زندگی اس کے پاس ایک امانت ہے۔ اس زندگی کو برتنا اس انسان کا سب سے بڑا مقصد ہے لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی خودی کی تکمیل ضروری ہے۔ اس خودی کی نوعیت صرف انفرادی ہی نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اجتماعی حیثیت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ انسان بہرصورت اجتماعی زندگی کا ایک جزو ہے خودی کی یہ تکمیل بھی بے مقصد نہیں ہوتی۔ اسی کے سہارے زندگی سنورتی اور سدھرتی ہے۔ اقبالؒ اسی خیال کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ویسے ان کے تصورِ عشق میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک جذب و شوق اور عمل و ولولہ کا نام ہے۔ ایک ایسا جذب و شوق اور ولولہ و عمل جو انسان کی روحانی اور مادی زندگی کو ہم آہنگ کر کے اپنے منتہائے کمال پر پہنچاتا ہے۔ اور جب یہ زندگی اپنے منتہائے کمال پر پہنچ جاتی ہے تو انسان میں انسان کامل کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ یہی انسان اقبال کے خیال میں

مردِ مومن ہے۔ وہ مردِ مومن جس کے دست و بازو کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ جس کے خون میں آگ کی گرمی اور جس کی نظر میں تلوار کی تیزی ہوتی ہے۔ جس کا نعرۂ یقین زنجیروں کو کاٹ دیتا ہے اور جس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ یہ تقدیروں کا بدلنا اقبال کے فکر و فلسفے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے سارے خیالات و نظریات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ اسی اجمال کی تفصیل اور اسی رمز کی تفسیر ہیں۔

اقبالؒ کا یہ فکر و فلسفہ خلا میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کے پیچھے ایک تاریخی سیاسی، تہذیبی اور عمرانی پس منظر ہے۔ یہی پس منظر اس فکر و فلسفہ کا محرک ہے۔ اقبالؒ کی نظر میں مسلمانوں کا انحطاط و زوال اور اس انحطاط و زوال کے سائے میں پرورش پائی ہوئی وہ انفعالیت اور قنوطیت تھی جس نے زندگی کا احساس مٹا دیا تھا۔ جذب و شوق کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ زندگی کے بنیادی مسائل کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ ترقی اور ارتقاء کے تصورات باقی نہیں رہ گئے تھے۔ اقبالؒ نے ان حالات کو بدلنے ہی کے لیے اپنے فلسفیانہ افکار و خیالات کی تشکیل کی۔ ان کے سدھارنے اور سنوارنے ہی کی خاطر اس کا سارا تانا بانا تیار کیا۔ یہی ان کا بنیادی مقصد ہے اور ان تمام خیالات و نظریات کی تان اسی مقصد پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ اقبال کا تنقیدی نقطہ نظر ان کے اس بنیادی مقصد سے الگ نہیں ہے۔ وہ اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فکر و فلسفہ کے بنیادی اصول اس تنقیدی نقطہ نظر میں یک جا نظر آتے ہیں۔

اقبال حیات و کائنات میں کسی چیز کو بے کار نہیں سمجھتے۔ ہر چیز ان کے نزدیک کوئی نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے وہ ادب اور فنونِ لطیفہ کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ملکہ بھی بے کار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ انسانی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، اس لیے اس سے خاطر خواہ کام لینا چاہیئے۔ وہ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ لوگوں نے محض حالات کے زیر اثر فنون لطیفہ کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ اور

بیشتر اسے محض ایک ذہنی تعیش کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے قوموں کو سُلایا۔ انھیں زندگی سے فرار سکھایا۔ یہاں تک کہ زمانے سے مقابلے کی سکت ان کے اندر باقی نہ رہی۔ اقبال اسی کو خودی کی موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں انھوں نے اس کا اظہار کیا ہے:

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود اُن کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے، اقبال فنونِ لطیفہ کو سیاست اور دین سے الگ نہیں کرتے۔ وہ انھیں ان سب کا ترجمان اور عکاس سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی بلندی کا انھیں احساس ہے۔ لیکن یہ بلندی ان میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب خودی کی حفاظت ان کے پیشِ نظر ہو ورنہ وہ محض فسون و افسانہ بن کر رہ جاتے ہیں اور محض فسون و افسانہ قوموں کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ کیونکہ ان سے خودی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ بہرحال اقبالؒ فنونِ لطیفہ کو انسانی زندگی میں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن یہ اہمیت ان کے نزدیک اسی وقت تک ہے جب تک وہ زندگی کی صحت مندانہ قدروں کے ترجمان، عکاس اور علم بردار ہیں۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کرنا ان کے لیے فنونِ لطیفہ کی موت ہے۔

زندگی اور فنونِ لطیفہ کا باہمی ربط اقبال کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن زندگی کو وہ

ب مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک جذب و شوق کا نام ہے۔ ایک جنون و دیوانگی کا نام ہے۔ جب تک فرد اور جماعت کی زندگی میں یہ جذب و وق اور جنون و دیوانگی نہ ہو، وہ زندگی سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ن زندگی کو فنونِ لطیفہ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے بغیر فنونِ لطیفہ کی لیق ہی ناممکن ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں: ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ می باید جنونِ پروردہ
آتش اندر خونِ دل حل کردہ

تو گویا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ کو زندگی کی پکار اور دل کی آواز ہونا ہیے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے پاس زندگی اور اس کے معاملات گہرا شعور ہو۔

اقبالؒ کے تنقیدی نقطہ نظر میں اس شعور کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بغیر اس شعور کے ندگی اور اس کے مسائل کی ترجمانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسی لیے وہ فنونِ لطیفہ کی تخلیق شخصیت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں نغمۂ نَے میں سرورمے، نے نواز کے ل سے پیدا ہوتا ہے: ؎

آیا کہاں سے نغمۂ نَے میں سُرورِ مَے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے
دل کیا ہے؟ اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اک نگاہ اُلٹتی ہے تختِ کے

کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے
کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ رُوم و شام و رے
جس روز دل کے رمز مغنّی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے،

لیکن یہ شخصیت اقبالؒ کے یہاں کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اس کی تشکیل و تعمیر بہ ذاتِ خود اپنے اندر ایک دنیا رکھتی ہے۔ اس کے لیے زندگی کے احساس اور حالات کے شعور کے ساتھ ساتھ جذب و شوق لازمی ہے۔ اور یہ جذب و شوق اس وقت تک کوئی کام نہیں کر سکتا جب تک فن کار کے پاس ایمان کی دولت نہ ہو۔ ایمان کی دولت ہی ولولے اور عمل میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہے۔ اسی لیے وہ صرف اس فن کو پائدار سمجھتے ہیں جس کو کسی صاحب ایمان اور مردِ خدا نے تخلیق کیا ہے۔ ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اقبالؒ کے خیال میں اس ثباتِ دوام کے لیے عشق کا وہ عمل درکار ہے جو مردِ خدا کی شخصیت کا لازمی جزو ہوتا ہے، اور جس کو اقبالؒ اصل حیات سمجھتے ہیں۔ لیکن فنونِ لطیفہ کی تخلیق میں عقل و شعور کو انھوں نے بھی خاص اہمیت دی ہے۔ اپنی ساری شاعری میں صرف ایک جگہ انھوں نے عقل کو عشق پر غالب دکھایا ہے اور وہ جگہ ادب اور فنونِ لطیفہ ہے۔ ادبیات کے متعلق ان کا ایک مشہور قطعہ ہے: ؎

عشق اب پیروئ عقلِ خداداد کرے
آبروئے کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے

کہنہ پیکر میں نئی رُوح کو آباد کرے
یا کہن رُوح کو تخلیق سے آزاد کرے

جس سے صاف ظاہر ہے کہ فنونِ لطیفہ کا تعلق ان کے نزدیک صرف جذبے سے نہیں ہے، بلکہ عقل سے بھی گہرا ہے۔ اور اس کا انحصار تمام تر فن کار کی شخصیت پر ہے۔ اسی لیے شخصیت اقبالؒ کے تنقیدی نقطۂ نظر میں بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔

جب فنونِ لطیفہ میں جذب و شوق اور عقل و شعور برابر کے شریک ہو جاتے ہیں تو فن کار اپنے بُنیادی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ اس مقصد کے بغیر اقبالؒ کے خیال میں ادب اور فن اپنے صحیح مرتبے سے آشنا نہیں ہوتا۔ فن کار جب اس مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے فن کی تخلیق کرتا ہے تو اس کی نوعیت تمام تر سماجی اور عمرانی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ فن کار بہرحال ایک سماج کا فرد ہے اور سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے اس کے لیے ان مطالبات کا پورا کرنا بھی ضروری ہے جو زندگی اس سے کرتی ہے۔ یہ منزل فن کار کو "دیدہ بینائے قوم" بناتی ہے جو ملک و ملّت کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے اور اگر ایک عضو بھی مبتلائے درد ہو تو قوم کی یہ آنکھ اس پر روتی ہے، آنسو بہاتی ہے۔ یہی حال شاعر اور فن کار کا ہے۔ قوم اور ملّت کا سب سے بڑا انباض ہوتا ہے۔ اس کے پاس محسوس کرنے، سوچنے اور غور کرنے کی ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کے سہارے وہ تمام مسائل کا شعور حاصل کرتا ہے۔ ملّت کے سینے میں اس کی حیثیت دل کی ہوتی ہے۔ جس قوم میں یہ دیدہ بینائے قوم نہیں ہوتا وہ "انبارِ گِل" ہو کر رہ جاتی ہے: ؎

شاعر اندر سینۂ ملّت چوں دل
ملّتے بے شاعرے انبارِ گِل
سوز و مستی نقشبندے عالمے ست

شعر را مقصود اگر آدم گری ست
شاعری ہم وارث پیغمبری ست

لیکن جو صحیح معنوں میں شاعر ہے وہ ملّت کو انبارِ گِل نہیں ہونے دیتا۔ اس طرح کہ وہ اپنے اندر سوز و مستی کے چراغ جلاتا ہے جس کی روشنی میں شاعری صرف ماتم ہی باقی نہیں رہتی بلکہ وہ لوگوں کو زندگی کا صحیح راستہ دکھاتی ہے۔ چنانچہ اس کا بنیادی مقصد "آدم گری" ہو جاتا ہے اور وہ اس طرح "وارثِ پیغمبری" بن جاتی ہے۔ یہی منزل شاعری کی اصل منزل ہے اسی کو اس کے کمال کی معراج سمجھنا چاہیے۔

لیکن اس منزل کا حصول آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے حقائق زندگی کی صحیح نباضی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ نباضی بغیر ایک دور بین اور دور رس نظر کے ناممکن ہے۔ اس کے لیے تو ایک سوزِ حیاتِ ابدی کی ضرورت ہوتی ہے جو فن کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اسی کو اقبالؒ "ضربِ کلیمی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ضربِ کلیمی ان کے خیال میں فن کے لیے ضروری ہے اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ قوم و ملت پر افسردگی طاری نہ ہو بلکہ ایک ولولۂ تازہ نصیب ہو جو زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دے: ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ ہنر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو!
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

اقبالؒ کے نزدیک یہی فنونِ لطیفہ کا مقصد ہے۔ اگر یہ مقصد اس کے پیشِ نظر نہ ہو تو پھر وہ قوم کے لیے ایک مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں۔ انفعالیت اور قنوطیت، کلبیت اور فرار کا ان پر غلبہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ کہیں کے نہیں رہتے۔

اقبال نے فنونِ لطیفہ کے لیے جن باتوں کو ضروری قرار دیا ہے وہ سب کی سب اگر اس کے اندر موجود ہوں تو اس کی نوعیت انسانی اور آفاقی ہو جاتی ہے۔ اقبال فن میں اسی انسانیت اور آفاقیت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ سوزِ حیاتِ ابدی اور ضربِ کلیمی سے ان کی یہی مراد ہے — زندگی اور اس کی قدروں کا صحیح احساس دلانا، بلکہ ان کو عام کرنا ان کے خیال میں فنونِ لطیفہ کا بنیادی مقصد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی فکر کا محور اسلام ہے۔ لیکن وہ اسلامی اصولوں کو انسانیت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اس لیے فنونِ لطیفہ میں، جہاں اسلامی قدروں کی طرف انھوں نے توجہ دلائی ہے، وہاں بھی ان کی مُراد انسانی اقدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال فنونِ لطیفہ کو محدود کرنے کے قائل نہیں۔ وہ تو اپنے مخصوص انداز میں یہ پیام دیتے ہیں:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

صاف ظاہر ہے کہ اقبالؒ فنونِ لطیفہ کو محدود کرنے کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں تو وہ اپنے اندر ایک ہمہ گیر وسعت رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کا اثر عالمگیر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال فنون میں قومی روایات اور قومی خصوصیات کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں تقلید فن کی موت ہے اور جو فن کار اس تقلید پر اپنے فن کی بنیاد رکھتے ہیں، ان کی خودی کا خون ہو جاتا ہے۔ اس لیے فنونِ لطیفہ کی تخلیق ان کے بس کی بات نہیں رہتی۔ مشرقی فن کاروں میں مغرب پرستی کا رجحان اسی وجہ سے انھیں ایک آنکھ نہیں

بھاتا اور وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ مغربی تقلید کے نتیجے میں مشرق کا سرورِ ازلی ان فن کاروں کے فن سے رخصت ہو گیا ہے۔ اور اس طرح ایک مرگِ تخیل عام ہو گئی ہے: ؎

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی!
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

آئینۂ فطرت میں اپنی خودی کے دکھانے سے اقبال کا یہی مطلب ہے کہ اپنی انفرادیت کو بہر صورت برقرار رکھنا فن کار کا اوّلیں فرض ہے۔ کہ اسی انفرادیت کے سہارے مخصوص قومی روایات اور مقامی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ اقبالؒ کے یہاں تہذیبی معاملات کا گہرا شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان روایات کو اہمیت دیتے ہیں جن سے کسی ملک اور قوم کی تہذیب عبارت ہوتی ہے۔

اقبالؒ کا زاویہ نظر تمام افادی ہے۔ ان کے فلسفہ و فکر کی بنیادیں پوری طرح اسی افادیت پر استوار ہیں۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ وہ ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی اسی افادیت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں جو فن تعیش کی طرف لے جاتا ہے اس میں زندگی کی رمق باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ زندگی صرف لذّت اور تعیش کا نام نہیں ہے۔ اسے صرف افسانہ و افسوں سمجھنا نادانی ہے۔ وہ تو جوئے

شیر و تیشہ سنگ گراں کا نام ہے۔ اس لیے شعر اور فن میں جو دل آویزی اس ذہنی تعیش کے خیال یا اثر سے پیدا ہوتی ہے اسے وہ اچھا نہیں سمجھتے۔ شعر عجم انھیں اسی وجہ سے ناپسند ہے : ؎

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولت پرویز
اقبال یہ ہی خارا تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بہ آئینہ نمایند آپر ہیز

وہ شعر و فن میں خارا تراشی اور کوہ شکنی چاہتے ہیں۔ اسی لیے عجمی لے کی طربناکی اور دل آویزی انھیں اچھی نہیں لگتی۔ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ اس طربناکی اور دل آویزی سے روح خوابیدہ اور بدن بیدار ہوتا ہے اور بدن کی بیداری کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ ہنروران ہند سے انھیں یہی شکایت ہے : ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بے زار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

عورت کا اعصاب پر سوار ہونا بظاہر ایسی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ لیکن جن حالات میں ہند کے شاعروں اور صورت گروں نے عورت کو اپنے اعصاب پر سوار کیا ہے، اس میں ان کا یہ فعل زندگی سے ایک فرار کی صورت اختیار کر لیتا ہے — کیونکہ ناسازگار حالات میں عورت سے یہ والہانہ دلچسپی اس کے لیے غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ اور زندگی کی حقیقتوں سے چشم پوشی کرنے کا ایک وسیلہ بن جاتی ہے۔ اقبال کا فکر اور فلسفہ اس کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ انھیں سب سے پہلے قوموں اور ملکوں کی زبوں حالی نظر آتی ہے۔ ایسی زبوں حالی جس نے افراد کی خودی کو ختم کر دیا ہے اور زندگی کے آثار ان کے اندر باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ اسی لیے وہ فنونِ لطیفہ میں زندگی اور اس کا احساس و شعور دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ احساس و شعور فنونِ لطیفہ میں تیزی و تندی پیدا کرتا ہے۔ اسی کے سہارے شاعر اور فن کار کے سینے میں نفس بیدار ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے افکار کی شراب اپنے اندر شمشیر کی سی تیزی پیدا کرتی ہے: ۵

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس تیرے
شاعر! ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی مے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

ہر لحظہ نیا طُور نئی برقِ تجلّی !
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اقبالؒ اسی مرحلۂ شوق کے طے نہ ہونے میں حسن دیکھتے ہیں۔ ہر لحظہ نئے طور اور نئی برق تجلی میں انھیں دلکشی نظر آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اقبال عمل کے پرستار ہیں اور عمل کی یہ پرستاری انھیں طاقت کا گرویدہ بنا دیتی ہے اور وہ اسی طاقت میں حسن دیکھنے لگتے ہیں۔ اسی لیے اقبال کے یہاں حسن اور عمل طاقت کا نام ہے۔ وہ جمال محض کے قائل نہیں ہیں، ان کی نگاہیں جلال ہی میں جمال کو دیکھتی ہیں: ؎

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدریؓ کافی
ترے نصیب فلاطون کی تیز یٔ اِدراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبال کا سارا فلسفہ انفعالیت کی نفی کرتا ہے۔ اسی لیے ان کی نگاہیں نغمے کو آتشناک دیکھنا چاہتی ہیں۔ اقبال کے خیال میں بغیر اس آتشناکی کے حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہی آتشناکی حسن کا دوسرا نام ہے۔

یہ خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اقبال فنون لطیفہ میں صورت سے زیادہ معنی اور ہیئت سے زیادہ مواد کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پاس حسن صورت کا احساس اور جمالیاتی اقدار کا شعور نہیں۔ وہ ان سب کا پاس لحاظ رکھتے

ہیں لیکن حسن صورت اور جمالیاتی اقدار کا تصور ان کے یہاں مختلف ہے۔ وہ انھیں مجرد اقدار تصور نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں تو ان کا وجود ہی اس وقت ہوتا ہے جب معنویت اپنے شباب پر پہنچتی ہے۔ جب خیال اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے ـــــ درحقیقت ان کے خیال میں حسن تخلیق کا محرک ایک "سوزِ دروں" ہی ہوتا ہے۔ اپنی نظم "فوارہ" میں انھوں نے بڑی خوبی سے اس بنیادی خیال کی وضاحت کی ہے: ؎

یہ آبِ جو کی روانی، یہ ہم کنار یِ خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ،
ادھر نہ دیکھ اُدھر دیکھ اے جوانِ عزیز!
بلند سوزِ دروں سے ہوا ہے فوّارہ!

اس سے اقبالؔ کی مراد یہ بھی ہے کہ صورت میں سوزِ دروں سے ایک مخصوص قدر پیدا ہوتی ہے۔ اس قدر میں حُسن بھی ہے اور رفعت و ترفع (Sublimeness) بھی۔ بلکہ حُسن ہے اس لیے رفعت و ترفع ہے اور رفعت و ترفع ہے اس لیے حُسن ہے۔ اقبال کے خیال میں یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں جہاں اقبال نے شعر و نغمہ کے لیے خونِ جگر کی اصطلاح استعمال کی ہے وہاں انھوں نے انھی بنیادی تصورات کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ خونِ جگر کے بغیر نغمہ ایک سودائے خام ہے اور جب یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ نغمہ سننے میں جو سرور سے پیدا ہوتا ہے، اس کی اصل نے نواز کا دل ہے نہ کہ چوب نے تو گویا اس تصور کو پیش کرتے ہیں کہ معنی و صورت اور مواد و ہیئت میں ایک ایسا رشتہ ہوتا ہے جو ٹوٹ جائے تو فن وجود میں نہیں آتا۔ فن ان دونوں کے مجموعے کا نام ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے انھوں نے کہا ہے: ؎

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

جلال وجمال اقبال کی مخصوص اصطلاحیں ہیں۔ ان کے پردے میں انھوں نے اس بنیادی خیال کی وضاحت کی ہے کہ حسن صورت کا انحصار تمام تر معانی وخیال پر ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فن کی تخلیق اقبال کے نزدیک کوئی اضطراری فعل ہے۔ اقبال اس کو ایک شعوری کوشش بھی سمجھتے ہیں اور جمالیاتی اقدار کو بیدار کرنے میں تو یہ شعوری کوشش ان کے خیال میں لازمی ہے۔ اسی لیے فن کی تخلیق میں وہ محنت کے قائل ہیں۔ "ایجاد معانی" میں انھوں نے بڑی خوبی سے اس بنیادی خیال کا اظہار کیا ہے: ؎

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد!
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد!

ایجاد معانی کو خداداد تسلیم کرتے ہوئے بھی اس بات کا قائل ہونا کہ ہنرمند کوشش سے آزاد نہیں ہوتا اس بات کی دلیل ہے کہ تخلیق فن کے لیے وہ کاوش اور محنت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اسی سے اس میں حسن کی قدر پیدا ہوتی ہے اور فن صحیح معنوں میں فن بنتا ہے، لیکن حسن ان کے خیال میں، جیسا کہ پہلے بھی اظہار کیا گیا، کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معنی وخیال سے علیحدہ ہو۔

اقبال فنونِ لطیفہ کی تخلیق کو اسی وجہ سے آسان نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک وہ ایک خاصا دشوار کام ہے اور اسی لیے اہم ہے۔ اقبال کے خیال میں انسان کی پیہم کوشش اور مسلسل کاوش نے فنون لطیفہ کا ایک حسین نگارخانہ تعمیر کیا ہے جس پر انسانیت فخر کر سکتی ہے۔ اور اس فخر کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں

انسان اور انسانی زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ پیغام حیات ابدی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی حیثیت نغمۂ جبریل اور "بانگ اسرافیل" کی ہو جاتی ہے۔ اقبال اسی وجہ سے بڑے فخر کے ساتھ پکار اُٹھتے ہیں: ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عظمت، انسانی تہذیب کا کمال، اس کے فکر و خیال کی صحیح معراج اگر کہیں صحیح طور پر بے نقاب نظر آتی ہے تو فنون لطیفہ میں اور صحیح بات یہ ہے کہ انسان اور انسانیت کے صحیح خد و خال کو اسی آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے!

یہ تمام خیالات اقبالؔ کے یہاں کسی بڑی مربوط شکل میں موجود نہیں ہیں۔ وہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کو یکجا کیا جائے تو ان میں ایک منطقی تسلسل پیدا ہوتا ہے اور اسی منطقی تسلسل میں سے ان کے تنقیدی نقطہ نظر کا پیکر ابھرتا ہے۔

اقبال کے اس تنقیدی نظریہ میں خاصی گہرائی ہے۔ یہ ایک مُفکّر کا تنقیدی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اردو تنقید میں اقبال سے قبل کسی نے اس طرح مفکرانہ انداز میں اپنے تنقیدی نقطہ نظر کو پیش نہیں کیا۔ ویسے حالی کے تنقیدی نقطہ نظر میں بھی خاص گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد حکیمانہ شعور پر استوار ہے۔ اس کی نوعیت سماجی اور عمرانی ہے۔ لیکن وہ

فلسفیانہ رنگ و آہنگ جو اقبالؒ نے اپنے تنقیدی نظریہ میں دیا ہے، اس میں نہیں ہے۔ خیالات کم و بیش ایک ہی سے ہیں۔ بس فرق فلسفے اور فکر کا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اقبال کا تنقیدی نقطۂ نظر اپنے اندر ایک وسعت اور کشادگی بھی رکھتا ہے۔ حالی کی نظر اپنے گرد و پیش پر پڑتی ہے اور ان کی مفکرانہ نظر ان گہرائیوں میں بھی جا پہنچتی ہے جہاں ہر ایک کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ اقبال نقاد ہیں، لیکن حالی کی طرح نقاد نہیں ہیں۔ حالی نقاد ہیں کیونکہ انھوں نے تنقیدیں لکھی ہیں — تنقیدی مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ ان پر تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ وہ ان میں سے ہر ایک کی گہرائیوں میں گئے ہیں۔ اقبال نے تنقیدیں نہیں لکھی ہیں۔ انھوں نے صرف اپنے اشعار میں اپنے تنقیدی نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ اس لیے وہ تجزیہ نہیں کر سکے ہیں۔ ان سے بحثیں نہیں ہو سکی ہیں۔ کیونکہ نظم میں اس کی گنجائش نہیں تھیں۔ ان کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے اس کام کو آگے بڑھایا جس کی ابتدا حالی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ حالی اُردو کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ اقبال نے اگر نثر میں اپنے تنقیدی نقطہ نظر کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہوتا تو ان کا حالی سے بڑھ جانا یقینی تھا۔ اب وہ حالی پر اضافہ ضرور ہیں لیکن حالی سے آگے نہیں ہیں۔ بہرحال بنیادی بات تو یہ ہے کہ وہ حالی کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں اور اسی میں ان کی بڑائی کا راز ہے۔

یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اقبال اپنے زمانے کے جمالیاتی نظریات اور تنقیدی تحریکوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ مثبت اور منفی کسی انداز میں بھی جمالیاتی نظریات اور تنقیدی تحریکوں کا ان کے تنقیدی نقطہ نظر پر کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ کروچے ان کے زمانے کا سب سے بڑا ماہر جمالیات ہے لیکن اقبال نے اس کے نظریات کی طرف مطلق توجہ نہیں کی ہے۔ الیٹ ان کے زمانے ہی میں اپنے تنقیدی

نظریات کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ آئی۔ اے رچرڈس کی ساری تنقیدی تحریک ان کے زمانے ہی میں چلی ہے لیکن انھیں جیسے اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ اسپنگارن کی تاثراتی تنقید کی تحریک بھی اسی زمانے کی پیداوار ہے لیکن اقبال جیسے اس سے واقف ہی نہیں ہیں۔ لینن اور گورکی کے تمام تنقیدی نظریات انھیں کے زمانے میں عام ہوئے ہیں لیکن انھوں نے ان مارکسی نظریات کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ پھر بھی یہ بات اتنی عجیب نہیں جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اقبال کے تنقیدی نقطہ نظر کو اپنے زمانے کی تنقیدی تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنے زمانے کے فلسفیوں سے واقف ہیں۔ ان میں سے بعضوں کی طرف انھوں نے توجہ بھی کی ہے۔ اس لیے ان کے اثرات کی جھلک مثبت یا منفی انداز میں، کہیں کہیں ان کے تنقیدی نقطۂ نظر میں مل جاتی ہے۔ البتہ خالص جمالیاتی نظریات اور تنقیدی تحریکوں کے اثرات نظر نہیں آتے۔

بات یہ ہے کہ ان کا تنقیدی نقطہ نظر ان کے فلسفے ہی کا ایک جزو ہے۔ اسی لیے ان کے تنقیدی نقطہ نظر میں فلسفہ نظر آتا ہے اور فلسفے میں تنقیدی نقطہ نظر!

اقبال کی عظمت

اقبالؒ جدید دور کے ایک بہت بڑے شاعر اور ایک بلند پایہ مفکر تھے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مختلف زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن ان کے فکر و فن کی تہ تک بہت کم لوگ پہنچ سکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اقبال کی شخصیت میں ایسی ہمہ گیری ہے کہ ہر شخص اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے، اور اپنے مطلب کی باتیں نکال کر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے فکرِ اقبال کے صحیح خط و خال کو سمجھ لیا ہے۔ یہ اقبال کی بڑائی کی دلیل ضرور ہے لیکن اس صورتِ حال نے انھیں نقصان بھی پہنچایا ہے۔ ان کے فکر و فن کا جیسا تجزیہ ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہے، اور بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ اقبالؒ کے فکر و فن کا ماہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے فکر و فن میں اتنی گہرائی، اس قدر وسعت اور اس درجہ ہمہ گیری ہے اور ایسی عظمت ہے کہ اس کا سمجھنا کسی غیر متوازن اور جذباتی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اقبالؒ کو سمجھنے کے لیے فلسفی کے دماغ اور شاعر کے دل کے ساتھ ساتھ ایک انسانی شعور کی بھی ضرورت ہے۔ اس انسانی شعور کی روشنی میں ایک تجزیاتی اور تخلیقی زاویۂ نظر کے بغیر ان کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسانیت اور انسان دوستی کے صحیح شعور کے بغیر ان کے

فکر و فن کی عظمت کا سُراغ لگانا ناممکن ہے۔ بلکہ انسانیت اور انسان دوستی کا یہ شعور تو ان کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہی محور ہے جس کے گرد ان کے تمام افکار و خیالات گھومتے ہیں۔ یہی بنیاد ہے جس پر انھوں نے اپنے فکر و فن کی بنیاد استوار کی ہے۔ اسی لیے تو ان کے یہاں انسان دوستی کا خیال اتنی شدت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی ہر بات میں اس جذبے کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اقبالؒ نے اسی انسان دوستی کے شدید جذبے کے ماتحت اپنے فکر و فن میں انسانی پہلو کو مختلف زاویوں سے نمایاں کیا ہے۔ اور یہ پہلو اس حد تک ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے سامنے دوسرے پہلو بڑی حد تک پس منظر میں جا پڑتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے تمام خیالات، تمام احساسات، تمام نظریات اسی انسانیت اور انسان دوستی کی منزل سے ہم کنار ہونے کے لیے رواں دواں نظر آتے ہیں۔

اقبال کے افکار و خیالات سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے۔ انھوں نے مغرب و مشرق کے بہت سے فلسفیوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی ایک فلسفے کے ساتھ بہ نہیں گئے ہیں۔ انھوں نے ان فلسفیوں سے وہ خیالات لے لیے ہیں جو ان کے انسان دوستی کے نظریے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان خیالات کے امتزاج سے انھوں نے انسان دوستی کے نظریے کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک فلسفیانہ خیال بھی ان کے یہاں ایسا نہیں ملتا جو ان کی انسان دوستی کو سہارا نہ دیتا ہو۔ ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں، حیاتِ انسانی کا ایک نظام فکر ہے جس میں انسان دوستی کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف فلسفیوں کے گہرے اثرات ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کی بات انھوں نے مانی نہیں ہے۔ ہر ایک کے خیالات کو تسلیم نہیں کر لیا ہے بلکہ ہر ایک کے خیالات میں سے ایسی باتیں لے لی ہیں جن سے ان کا مقصد پورا ہوتا ہے، جو ان کے بنیادی نظریات کی تشکیل و تعمیر

ہیں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی ہے۔ اس فلسفے کے جو عناصر ہیں وہ سب انسانیت کے گرد گھومتے ہیں۔ ان سب کی تان انسان دوستی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اقبال نے اس فلسفے کو صرف خیالی نہیں ہونے دیا ہے اس سے متعلق ہر فلسفیانہ خیال کو عمل سے ہم آہنگ کیا ہے۔ انسانیت کی بلندی کا خیال اس عمل کی جولانگاہ ہے۔

فلسفیوں میں انھوں نے نٹشے سے استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ وہ اسے "مجذوب فرنگی" کہتے ہیں۔ اور اسے خود یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ مقامِ کبریا کیا ہے۔ برگساں سے بھی وہ کسی حد تک متاثر ہیں۔ کانٹ، ہیگل اور مارکس سے بھی انھوں نے بعض خیالات لیے ہیں۔ اسلامی مفکروں میں رومی کو تو خیر انھوں نے اپنا مرشد اور رہنما ہی مانا ہے، لیکن ابن سینا، ابن العربی اور جمال الدین افغانی کے اثرات بھی ان پر کچھ کم نہیں ہیں۔ ان تمام خیالات کو انھوں نے ایک مرکز پر جمع کیا ہے۔ یہ مرکز انسان دوستی کا مرکز ہے۔ یہیں سے ان کی انفرادیت وجود اختیار کرتی ہے۔ اسی لیے ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں رہ گیا ہے انسانی زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل بن گیا ہے۔ وہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ ایک پیغام ہے اس زخمی انسانیت کے لیے جو زخموں سے چُور ہے جو سر سے پاؤں تک لہولہان ہے جو صدیوں سے جبر و استبداد کے پیروں تلے پڑی تلملا رہی ہے۔

یہ خیالات ان لوگوں کے لیے کسی قدر عجیب اور نامانوس ضرور ہیں جو اقبال کو اسلامی طرز فکر اور اسلامی نظامِ حیات کی طرف جھکتے ہوئے دیکھ کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی زندگی ہے صرف انھیں کے مسائل ہیں وہ صرف مسلمانوں ہی کو اس دنیا میں سرخرو اور سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اقبال کے فن کو اس طرح دیکھنا، اس کی رُوح کا خون کرنا

ہے۔ اس میں تنگ نظری بھی ہے اور کم ظرفی بھی!

ویسے یہ بات ٹھیک ہے، اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ اقبالؒ نے اپنے فکر و فن کی بنیادیں اسلامی نظریات اور اسلامی نظام حیات پر رکھی ہیں۔ لیکن ان اسلامی نظریات نے انھیں محدود نہیں کیا ہے۔ ان کے یہاں تنگ نظری نہیں پیدا کی ہے۔ برخلاف اس کے ان کے شعور کو بیدار کیا ہے، اس کو وسعت دی ہے۔ کیونکہ اسلام ان کے نزدیک تنگ نظری سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس میں ایک ہمہ گیری ہے، ایک وسعت ہے، ایک بلندی ہے، انسانی مساوات اور اخوّت، انسانی ہمدردی اور محبت، انسانی بلندی اور برتری کو اس نظام حیات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات بھی رکھتا ہے۔ رُوحانی اور مادی دونوں اعتبار سے وہ انسانیت کو منتہا پر پہنچانے کا خواہش مند ہے۔ معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی اقدار میں ہم آہنگی کا خیال ہمیشہ اس کے پیش نظر رہا ہے اسی لیے اس نے انسانیت کو ہر دور میں ہر اعتبار سے آگے بڑھانے اور سربلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلامی نظریات کو انسانی فکر کی تاریخ میں نمایاں حیثیت دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اسلام نے انسانیت کو آدابِ مدنیت سکھاتے ہیں اور اس کو تہذیب سے ہم کنار کیا ہے۔ اسلام نے طبقاتی تفریق کو بڑی حد تک ختم کیا ہے۔ مساوات کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے، اور بے لوث انسانی خدمت کا جذبہ افراد کے دلوں میں بیدار کیا ہے اور ایثار اور قربانی کو فرد اور جماعت دونوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے! اقبال اسی لیے تو اس نظام حیات کے بنیادی اصول اور نظریات کے پرستار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس پرستش اور وابستگی میں ایک انسانی بلندی کا احساس شامل ہے۔ انسانیت کو ارتقا کے راستے پر گامزن کرنے کی خواہش پوشیدہ ہے، زندگی کو اقدارِ شر سے پاک کرنے اور اقدارِ خیر سے ہم کنار کرنے کی آرزو کارفرما ہے۔

یوں دوسرے نظریاتِ حیات بھی انسانی زندگی میں موجود ہیں لیکن اقبال کے خیال میں وہ مجموعی اعتبار سے مکمل نہیں ہیں۔ کوئی مادی اعتبار سے مکمل ہے تو کوئی روحانی اعتبار سے۔ مادیت اور روحانیت کا سنگم اگر کہیں ملتا ہے تو وہ اسلامی نظام حیات ہے اور یہ دونوں اسلام کی تکمیل کے لیے لازمی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی تکمیل کے بغیر انسانیت کی تکمیل اور بلندی ناممکن اور محال ہے۔ اس روحانیت اور مادیت کے صحیح امتزاج اور ہم آہنگی کی خصوصیتیں صرف اسلامی نظام حیات میں مل سکتی ہیں۔ اسلام رُوحانی اور مادی اعتبار سے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی عالمگیر برادری کا نام ہے جس میں امتیاز رنگ و خون نہیں ہوتا جس میں نسل اور قوم کی قید نہیں ہوتی، بلکہ اس لڑی میں منسلک ہونے کے بعد ہر فرد جہانِ رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جاتا ہے اس طرح کہ نہ کوئی تورانی باقی رہتا ہے نہ ایرانی! اور ظاہر ہے ایسا کرنے سے اسلام کا مقصد صرف انسانیت کی بلندی اور سرفرازی ہے وہ زندگی بسر کرنے کا ایک لائحہ عمل بھی صرف اسی انسان اور انسانیت کے خیال سے پیش کرتا ہے۔ اس نے ہر اعتبار سے زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی تاکید کی ہے۔ لیکن صرف مادیت اس کا نصب العین نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ رُوحانیت کی فضا میں پرواز کرنا بھی سکھاتا ہے یہ دونوں پہلو اسلامی نظام میں گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے نظریاتِ حیات میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر میں یا تو تمام تر روحانیت ہی روحانیت ہے۔ یا مادیت ہی مادیت!

دورِ جدید کے نظام زندگی میں نظریۂ اشتراکیت اقبال کو اہم معلوم ہوتا ہے وہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ انھیں اس نظریے سے بنیادی اختلافات ہیں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود وہ اس کی بڑائی کے قائل ہیں۔ انھیں اشتراکیت کے بانی

کارل مارکس سے بنیادی طور پر نظریاتی اختلافات ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں وہ "کلیم بے تجلی" اور "مسیح بے صلیب" ہے۔ اور ہر چند کہ اسے پیغمبر نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کی بغل میں کتاب ضرور موجود ہے:

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور روس میں لینن کے ہاتھوں اس کے نقطۂ نظر کو جو عملی جامہ پہنایا گیا ہے، ارتقائے انسانیت کی تاریخ میں وہ اس کی اہمیت کے معترف ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے خیال میں روحانیت کو خیرباد کہہ دینے کی وجہ سے روس کے یہ تمام تجربات بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے خیال میں روس نے ایسا کر کے اپنے آپ کو ایک دلدل میں پھنسا لیا ہے اور اسی لیے اس نے ترقی کے بہت سے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں۔ زندگی کی راہ میں جس طرح اس کو آگے بڑھنا چاہیے تھا نہیں بڑھ سکا ہے۔ لیکن وہ اس سے مایوس نہیں ہیں بلکہ اس کے متعلق ایک رجائی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اور انھیں یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنے آپ کو اس دلدل سے ضرور باہر نکال لے گا کیونکہ آئین زندگی سے صحیح مطابقت کے بغیر کوئی انسانی نظام زندہ نہیں رہ سکتا۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ!
فکر او در تند باد لا بماند
مرکب خود را سوئے الا نراند
آیدش وقتے کہ از زور جنوں
خویش را زین تند باد آرد بروں

در مقامِ لانیا ساید حیات
سوئے الّا می خرا مد کائنا ت

اقبال کے خیال میں اشتراکیت ایک ایسا نظام ضرور ہے جو رنگ وخوں اور نسل وقوم کے سطحی امتیازات کو مٹانا چاہتا ہے۔ جس کے نزدیک طبقاتی تفریق کو مٹاکر ایک ایسے نظام کی تشکیل لازمی اور ضروری ہے جس میں نفرت نہ ہو، بغض و عناد نہ ہو، ہوس ملک گیری نہ ہو، غربت و امارت کا فرق نہ ہو اور دولت کی تقسیم غیر مساوی نہ ہو۔ اقبال اشتراکی نظام کے ان پہلوؤں کی اہمیت کے تو قائل ہیں۔ لیکن اس نظام نے روحانیت سے جو چشم پوشی کی ہے اس کے وہ دشمن ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں روحانیت کے بغیر انسانیت کی تکمیل ناممکن ہے اور انسانیت انھیں بہت عزیز ہے۔ اس لیے اشتراکیت کی کمی ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے روحانیت کے بغیر انسان میں اخلاقی اقدار کی پاسداری اور خلوص و صدق دلی ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی۔ جو نظام حیات بیک وقت ان تمام باتوں کو پورا کرتا ہے، وہ ان کے خیال میں اسلامی نظام حیات ہے، اور اسلامی نظام حیات ان کے خیال میں انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا دوسرا نام ہے۔

اقبال اسلام کو اشتراکیت کی طرح ایک تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ تحریک ان کے خیال میں انسان دوستی کا سبق دیتی ہے، ملک و ملت کے تفرقے مٹانا چاہتی ہے، طبقاتی تفریق کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتی ہے۔ اقبال اسی تحریک کے مُفکّر ہیں، اسی کے ترجمان ہیں اسی کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں نئی باتیں بھی کہی ہیں۔ اور پرانی باتوں کو نئے حالات سے مطابق کرکے نئے انداز میں پیش بھی کیا ہے وقت نے جن رگوں کو خون سے خالی کر دیا تھا، اقبال نے ان کے اندر ایک نیا خون زندگی دوڑایا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال نے اسلامی تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ

کر کے ایسی قومی برتری کا خواب دیکھا ہے جس کی تہ میں فسطائی رجحان کی جھلک ہے ، وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اس قوم کے دروازے کسی پر بند نہیں ہیں۔ اقبال ان دروازوں کو ہر ایک کے لیے کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کا یہ پیام انسان دوستی ان افراد کے لیے بھی ہے جو اس تحریک کے مخالف ہیں۔ ان کے لیے بھی ہے جو انسانی برادری کے اس رشتے میں منسلک ہونا نہیں چاہتے۔ اقبال انھیں دعوت دیتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے جلال و جمال دونوں کی آب و تاب دکھا کر انھیں اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ تاکہ انسانیت کی تعمیر صحیح اقدار پر ہو سکے۔ اقبال کی نظریں یہ دیکھتی ہیں کہ انسانیت گھائل ہے۔ قومی، نسلی اور ملکی تفریق نے اسے زخموں سے چور کر دیا ہے۔ ان کی تعلیم ان زخموں پر مرہم رکھنے اور اس طرح ان کو مندمل کرنے کی تعلیم ہے۔ ان کا پیام ان زخموں کو بھرنے کا پیام ہے ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی،
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے،
تو اے مُرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

یہ اخوّت کا بیان ہونا، یہ محبت کی زباں ہو جانا، یہ اچھل کر بیکراں ہو جانا اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اقبال کی تعلیم اور ان کے فلسفے کی بنیادی باتیں اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ انسانی زندگی میں اخوت اور محبّت کے چراغوں کو روشن رکھنا چاہتے ہیں۔ انسان کو بیکراں بنانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اور یہی اسلام بھی چاہتا ہے۔ اقبال نے اس بنیادی خیال کو زیادہ گہرائی اور رعنائی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی وجہ

یہ ہے کہ خرد نے انھیں حکیمانہ نظر عطا کی ہے اور عشق نے انھیں حدیث رندانہ سکھائی ہے۔ وہ رازِ درونِ میخانہ کے محرم ہیں۔ ان کی نظر اصلیت اور حقیقت تک پہنچی ہے۔ اس لیے ان کے یہاں اس سلسلے میں خلوص اور صدق دلی کا احساس ہوتا ہے، عقل و شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

یہ خیال یہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبالؒ نے اتحاد و اتفاق، اخوت و محبت کا یہ پیام صرف مسلمانوں کو دیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ مسلمانوں کا اتحاد، اس میں شک نہیں، کہ ان کے پیش نظر ہے۔ لیکن یہ اتحاد انھیں قدروں کو عام کرنے کے لیے ان کے پیش نظر رہا ہے اور ان قدروں کو وہ ساری انسانیت میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ انسانیت کا خیال کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اس خیال کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے واضح طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "دراصل انسانیت کی بقا کا راز اس کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی" اور اس دنیا کو درندگی اور بہیمیت سے پاک کرنا، اور اس طرح اس کو تہذیب سے ہم کنار کرنا ان کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کو صرف مسلمانوں ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی دیکھتے ہیں مسلمانوں کا خیال بے شک ان کے یہاں زیادہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اقبال خود مسلمانوں کی اس جمعیت سے تعلق رکھتے تھے، جس کو صدیوں کے مسلسل انحطاط و زوال نے کہیں کا نہیں رکھا تھا، جن کی انفرادیت ختم ہو چکی تھی جو اس زندگی میں بے یار و مددگار رہ گئے تھے اور جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا تھا۔ اس لیے اقبال کا ایک ایسی قوم کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہونا، انسان دوستی کے بنیادی خیال سے علیحدہ کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اسی کا

ایک حصّہ ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سارے مشرق کا خیال ان کے پیش نظر رہا ہے کیونکہ یہ دونوں زمانے کے ہاتھوں بری طرح پامال کیے گئے ہیں۔ ان اشعار میں سارے مشرق کی حالت کو بہتر بنانے کا احساس کتنا شدید ہے: ؎

تیرہ خاکم را سراپا نور کُن
در تجلی ہائے خود مستُور کُن
تا بروز آرم شب افکار شرق
بر فروزم سینۂ احرارِ شرق
از نوائے پختہ سازم خام را
گردشِ دیگر دہم ایّام را
فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ
از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اور ایک جگہ ہمالیہ، اٹک اور رود گنگ کو مخاطب کر کے ان خیالات کا اظہار کیا ہے: ؎

اے ہمالا! اے اٹک اے رود گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

ایک اور جگہ ہندوستانیوں کی باہمی کشمکش اور اس کے نتیجے میں فرنگی قوم کی کامیابی پر اس طرح خون کے آنسو بہاتے ہیں۔

؎

ہندیاں با یک دگر ا دیختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمین
ثالث آمد در نزاع کفر و دین
کس ندا ند جلوۂ آب از سراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

فکرِ مشرق کو دستِ فرنگ سے آزاد کرنے کی خواہش اور انقلاب کا یہ نعرہ انسان دوستی کے شدید جذبے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو مسلمان، ہندوستان اور مشرق سب کی پائمالی کا شدید احساس ہے۔ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اس پر جو دست درازیاں ہوتی رہی ہیں، وہ ان سے خوش نہیں ہیں، کیونکہ وہ ان دست درازیوں کو انسانیت اور انسان دوستی کے بنیادی اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔

اس ساری بحث میں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبال نے اپنے آپ کو صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں کیا ہے ان کے دل میں ہر پس پا افتادہ قوم اور پائمال فرد کا درد ہے۔ وہ ان افراد و اقوام کو بلند کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے خیال میں یہ بلندی انھیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو اپنا لیں کیونکہ ان کے خیال میں اسلامی اصول ہی انسان دوستی اور انسانیت کے اصول سے ہم آہنگ ہیں۔ اسلام کی ہر بات میں وہ انسانیت کی بہتری دیکھتے ہیں۔ اس کی پیش کی ہوئی تمام اقدار میں انھیں انسانیت پرستی کا خیال کارفرما نظر آتا ہے اور اس کی پیش کی ہوئی تمام اقدار میں انھیں بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود دکھائی دیتی ہے لیکن ان کے یہ خیالات کسی جذباتیت پر مبنی نہیں ہیں انھوں نے اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کیا ہے اور صحیح اسلامی نظام اقدار میں وہ طبقاتی کشمکش اور آویزش نظر نہیں آتی جس

نے آج ساری دنیا کو ہنگاموں کی آماجگاہ بنا دیا ہے ۔ ساری انسانی زندگی جن کی وجہ سے ایک اچھا خاصا میدان کارزار بن گئی ہے۔

اقبال نے اس کشمکش اور آویزش کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس آویزش اور کشمکش سے پیدا ہونے والے بنیادی مسائل کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں اسی لیے انھوں نے ان بنیادی مسائل کی طرف پوری طرح توجہ کی ہے۔ انسانی زندگی میں سرمایہ و محنت کی جو کشمکش جاری ہے، اس کا انھیں علم ہے۔ وہ اس کے سارے نشیب و فراز کو سمجھتے ہیں۔ اس کا سارا مد و جزر ان کے پیش نظر رہا ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر انھوں نے انسانی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انسانی زندگی کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کا اقبال کو بڑا دکھ ہے۔ وہ اس پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ اسی لیے تو اپنی شاعری کے ذریعے سے انھوں نے بندۂ مزدور کو بیداری کا پیام دیا ہے۔ وہ مشرق و مغرب میں اس کے دور کا آغاز دیکھتے ہیں۔ "خضر راہ" اور "شمع و شاعر" ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے انسانی زندگی کے انھیں بنیادی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے ان مسائل کو خالص انسانی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ جس زمانے میں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں، اس زمانے میں ان معاملات و مسائل کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنے کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا تھا۔ اقبال کو اس سلسلے میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ انسان دوستی کے شدید جذبے ہی نے اقبال سے ان اشعار کی تخلیق کرائی ہے:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے دہقان ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باران بھی تو، حاصل بھی تو
کیوں کسی کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا،
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو!
دیکھ آکر کوچہ چاکِ گریبان میں کبھی،
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو محمل بھی تو!
بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، یہ ہے پیامِ کائنات
اے کہ تجھکو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

ان اشعار میں انسان کی اہمیت کا صحیح احساس ہے۔ انسانی زندگی کے تاریخی ارتقا کا واضح شعور ہے۔ اقبال نے یہاں اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ انسان اس زندگی میں ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ جن لوگوں نے زندگی کے غلط نظام اقدار کا سہارا لے کر اسے شکنجوں میں کسنے کی کوشش کی ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں۔ ان کے جبر و استبداد کو پامال افراد کا احساس خودی بڑی آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ چنانچہ انسان کے لیے اپنی اہمیت کا صحیح احساس ضروری ہے کہ اسی احساس سے فکر و عمل کی صلاحیتیں بیدار ہو سکتی ہیں اور انسانی زندگی کو ارتقا پہ گامزن کرنے کے لیے راستے ہموار ہو سکتے ہیں۔ اور جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو سرمایہ دار حیلہ گر کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ نسل، قومیت، کلیسا، تہذیب اور رنگ کے بُت توڑے جا سکتے ہیں۔ بزم جہاں کا یہ انداز ہو تو مشرق و مغرب میں نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اقبال کے خیال میں یہ صورت حال انسانی زندگی کی ارتقائی کیفیت کے لیے از بس ضروری ہے!

اسی لیے تو وہ انسان کی تمام صلاحیتوں کو اس کام کے لیے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے غریبوں کو جگانا، کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دینا، غلاموں کا لہو سوز یقیں سے گرمانا، کنجشک

فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دینا ان کا پیام بن جاتا ہے۔ ان کی نگاہیں سلطانیٔ جمہور کو آتے ہوئے دیکھتی ہیں وہ ہر نقشِ کہن کو مٹانا، اور جس کھیت سے دہقاں کو روزی میسر نہ ہو، اس کے خوشۂ گندم کو جلانا چاہتے ہیں۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ!
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

اقبال کے یہ خیالات تمام تر انقلابی ہیں۔ ان میں ایک جارحانہ انداز ملتا ہے اور اس جارحانہ انداز کے پیدا ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کے نظامِ اقدار کو بدلنے کا گہرا احساس اور شدید جذبہ رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ انقلاب اور تبدیلی انسان اور انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی انقلاب پسندی کو انسان دوستی سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔

یہ خیالات و نظریات اقبال نے غور و فکر کے ساتھ پیش کیے ہیں ایسا کرنے کے لیے انھیں مختلف راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں تاریخ کے میدانوں کی خاک بھی چھانی ہے مذہبیات کی کوچہ گردی بھی کی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ارتقائی کیفیت کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ فلسفہ و نفسیات کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ عمرانیات و معاشیات کے اسرار و رموز بھی کھولے ہیں۔ غرض یہ کہ انھیں دور دور پہنچنا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس

پیام میں بڑی ہمہ گیری ہے۔ بڑی وسعت ہے بڑی گہرائی ہے اس کی بنیادیں زندگی کے حقائق پر استوار ہیں تنگ نظری اس میں نام کو نہیں ملتی۔ اس کا آب و رنگ اسلامی ضرور ہے لیکن وہ محدود نہیں ہے۔ اس میں کشادہ دلی اور روشن دماغی ہے، وقت نظری اور بلند خیالی ہے، بے باکی اور صاف گوئی ہے، اس میں ایک عمل کا پیام ہے۔ اور اس عمل کے پیام کی بنیاد ایک انسانی نقطۂ نظر ہے۔ اقبال نے بڑی خوبی سے اس کی وضاحت کی ہے:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد!
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
نہ فلسفی سے، نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد
درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہان نہ سمرقند!
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال اپنے آپ کو محدود کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے پیشِ نظر تو ساری دنیا ہے، ساری انسانیت ہے ساری کائنات ہے۔ اقبال کی تعلیم فروعی باتوں میں اُلجھ جانے کا نام نہیں ہے۔ وہ تو بنیادی انسانی معاملات پر نظر رکھتے ہیں، ان کے پیشِ نظر تو صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، اور وہ مقصد ہے انسانیت کی بلندی، اس کے مسائل کو حل کرنے کی آرزو، نظام اقدار میں ہماری کی تمنّا اور حالات کو ہر اعتبار سے بہتر بنانے کی خواہش کہ اسی طرح انسان صحیح معنوں میں انسان بن سکتا ہے۔

اقبال کی انسان دوستی کا یہ فلسفہ، جس کو ان کے پیام سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، کئی

عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ اقبال انسانی زندگی میں فرد کی اہمیت کے قائل ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے انھیں اس کی بلندی کا احساس ہے، احساس کی اس شمع کو وہ فرد کے دل میں فروزاں کرنا چاہتے ہیں اپنے فلسفے میں جس چیز کو انھوں نے خودی سے تعبیر کیا ہے، وہ یہی انسان کی بلندی کا احساس اور عظمت کا خیال ہے لیکن یہ خودی صرف فرد تک محدود نہیں رہتی۔ کیونکہ فرد انسانی زندگی کے اجتماعی نظام کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس لیے آگے چل کر یہ خودی اجتماعی خودی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ فرد کو اجتماعی زندگی سے علیحدہ کر لیا جائے، تو یہ ذات خود اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

خودی کا عمل ساری انسانی زندگی میں جاری ہے۔ اسی سے زندگی میں ایک حرکت ہے، ایک جولانی ہے، ایک سوز ہے وہ محبت کو پیدا کرتی ہے اور محبت سے اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔

نقطہ نُورے کہ نام او خودی است
زیرِ خاک ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پایندہ تر!
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

فرد اور جماعت میں خودی کی تکمیل کے لیے اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کا خیال ہونا لازمی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ توحید، رسالت اور قرآن پر ایمان بھی ضروری ہے۔ اقبال کے یہاں یہ باتیں محض رسمی اور روایتی انداز میں بیان نہیں ہوتی ہیں۔ انھوں نے ان میں نئے پہلو بھی نکالے ہیں، نئے گوشوں کو بھی تلاش کیا ہے۔ مثلاً توحید اقبال کے خیال میں ایک خدا پر ایمان رکھنے کا نام ضرور

ہے لیکن اس سے وہ انسانی وحدت کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے توحید سے یہ کام لیا بھی ہے۔ طاقت بھی اسی توحید کے خیال سے پیدا ہوتی ہے اور اقبال طاقت کے پرستار ہیں۔ طاقت میں انھیں حسن بھی نظر آتا ہے۔ اس جلال میں وہ زندگی کا جمال بھی دیکھتے ہیں:

ملتے چوں می شود توحید مست
قوّت و جبروت می آید بدست
فرد از توحید لاہوتی شود
ملّت از توحید جبروتی شود
ہر دو از توحید گیرد کمال
زندگی ایں را جلال، آں را جمال

اقبال طاقت کے ساتھ ساتھ فرد اور جماعت کے لیے محبت اور عشق کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور محبت اور عشق کا مفہوم ان کے یہاں محدود نہیں ہے۔ وہ تمام انسانی خصوصیات پر حاوی ہے:

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

لیکن ان کے دوسرے تصورات کی طرح ان کے اس تصوّرِ عشق کی نوعیت بھی اجتماعی اور انسانی ہے۔ انسان اور انسانیت کی تکمیل ان کے خیال میں اس کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ تمام خصوصیات جب کہیں یک جا ہوتی ہیں، تو ایک انسان کامل وجود میں آتا ہے، جس کو اقبال "مردِ مومن" کہتے ہیں۔ اس مردِ مومن کی تمام صلاحیتیں انسانی زندگی کو عظمت اور بلندی سے ہمکنار کرنے کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ارادوں میں

خاطر خواہ کامیابی حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کی ہستی میں ایمان کی روشنی ہوتی ہے ۔ عمل کی قوت ہوتی ہے وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے، زندگی کو ذوقِ پرواز سمجھتا ہے۔ سفر کو منزل سے بڑھ کر پسند کرتا ہے، محبت کو اپنا مسلک جانتا ہے، کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ بلکہ نومیدی کو زوالِ علم و عرفاں سمجھتا ہے، اس کی امیدیں خدا کے رازدانوں میں ہوتی ہیں۔ اس کی نظر میں تلوار کی تیزی کا جادو ہوتا ہے اور اس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں :

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے فکروفن میں اسی مردِ مومن اور انسانِ کامل کی آواز سنائی دیتی ہے ! اور اسی آواز میں ان کی عظمت کا راز ہے ۔

کلامِ اقبال میں عظمتِ انسانی کا تصوّر

علّامہ اقبالؒ کی شاعری میں موضوعات کے اعتبار سے تنوّع، وسعت اور ہمہ گیری ہے لیکن وہ بنیادی طور پر عظمتِ انسانی، انسانیت اور انسان دوستی کے شاعر ہیں۔ ان کے تمام افکار و خیالات اسی انسان اور انسانیت کے مختلف انفرادی اور اجتماعی معاملات و مسائل کے گرد گھومتے ہیں۔ انھوں نے ان مسائل کو سُلجھانے اور حل کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے۔ ان کے فکر و فلسفہ کا بنیادی موضوع یہی انسانی معاملات و مسائل ہیں۔ ان کے یہاں خودی کا جو تصوّر ملتا ہے، تسخیرِ فطرت کے جو خیالات نظر آتے ہیں، مردِ مومن اور انسانِ کامل کی جو تصویریں ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں، ان سب کی تہہ میں انسان سے ان کی دلچسپی اور انسانیت، انسان دوستی اور انسانیت پرستی کے رجحانات و میلانات کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ انسان سے محبت کرتے ہیں، وہ اس کی عظمت کے قائل ہیں، انھیں اس کے صحیح منصب کا احساس ہے، زندگی اُس سے جو تقاضے کرتی ہے۔ اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حیات و کائنات میں اس کی اہمیت کا احساس دلا کر اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔ وہ اس کو نئی زندگی، اس کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے احساس و شعور سے اس طرح آشنا کرتے ہیں کہ وہ

اپنے جنون کے لیے نئے ویرانوں کی تلاش کرتا ہے، اور نئے آسمانوں پر پرواز کرنے کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی ساری شاعری انھیں موضوعات اور معاملات و مسائل کی حدیثِ دلنشین اور تفسیرِ دلآویز ہے۔

عظمت اور فضیلت انسانی کے خیالات علامہ اقبالؒ کی شاعری میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ اقبالؒ نے انسان کی عظمت اور تمام مخلوقِ انسانی پر اس کی ناقابلِ تردید اور مسلّمہ فضیلت کا ذکر اپنے اُردو اور فارسی کلام میں بڑے واضح اور اکثر اوقات بڑے دلکش پیرائے میں کیا ہے۔ اس موضوع سے تعلق رکھنے والی گوناں گوں جزئیات کبھی انفرادی طور پر اقبال کے اشعار کا موضوع بنی ہیں۔ اور کبھی انھوں نے مرتب اور منظم نظموں کی صورت اختیار کی ہے۔ اقبال کے اس اہم موضوع کا سرچشمہ قرآنِ حکیم کی وہ آیات ہیں جن میں ایک طرف تو آدم کی تخلیق اور باری تعالیٰ کے آدم کو زمین پر اپنا نائب بنانے کا ذکر ہے، اور اس ذکر کے ساتھ اس کی فضیلتِ علم اور اس فضیلت کی بنا پر فرشتوں کے سجدے اور شیطان کے انکار کا بیان ہے، اور دوسرے وہ آیتیں ہیں جن میں کہیں اس کی فطرت کو فطرتِ الٰہی کے مطابق ٹھہرایا گیا ہے، کہیں اس کی تخلیق کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ بہترین انداز سے پر ہوئی ہے۔ کہیں امانت کا تذکرہ ہے جس کا بوجھ آسمان اور زمین نہ اٹھا سکے، اور انسان نے اٹھایا، اور کہیں انسان کے عمل کو جزا اور سزا کی اساس بنا کر اس حقیقت کی صراحت کی ہے کہ انسان کے تخلیقی عمل میں گرد و پیش کی ہر چیز کو اپنے مقاصد کا تابع بنانے اور اسے اپنے تصرف میں لانے کی بے پایاں صلاحیت ہے۔ حیاتِ آدم یا قصہ آدم کی بعض اور کڑیاں بھی ہیں جو اس داستان کو رنگین بھی بناتی ہیں۔ ان کڑیوں میں آدم کے ساتھ حوا اور ابلیس کے کردار سامنے آتے ہیں۔ ابلیس کی پیدا کی ہوئی ترغیب و تحریص کی بدولت انسان کے شعور اور ارادے کی قوتیں بیدار ہو کر عمل پیرا ہوتی ہیں اور بالآخر انسان کی عمل [illegible] ہیں قدم قدم اس کی رہنما [illegible] ہیں۔

اقبالؒ نے ان معاملات کی تفصیلات کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ انسان کی پیدائش، افکارِ ابلیس اور اس سلسلے کے تمام واقعات ان کی شاعری میں انسانی عظمت و فضیلت، اور جس طرح اس کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے، اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا یہ حصّہ انتہائی خیال انگیز بھی ہے اور حد درجہ دل آویز بھی۔

یوں تو اقبال کے ہاں انسان اور اس کی عظمت کے خیالات جگہ جگہ ملتے ہیں لیکن ان کی ایک مختصر لیکن مشہور نظم میں ان خیالات کا نچوڑ موجود ہے۔ اس کا عنوان ہے "فرشتے آدم کو بہشت سے رخصت کرتے ہیں"۔ اس مختصر سی نظم کے چند اشعار میں فرشتوں کی زبانی انسان کی عظمت کی کہانی کو علامہ نے اس طرح بیان کیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ اشعار کتنے معنی خیز ہیں:

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے تیرا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

ظاہر ہے کہ خود فرشتے جس کی ذات میں روز و شب کی بیتابی اور جس کی سرشت میں کوکبی و مہتابی دیکھتے ہوں، جس کا گریۂ سحر گاہی خود انھیں گراں بہا نظر آتا ہو، جس کی بدولت انھیں اس کے نخل کہن میں شادابی دکھائی دیتی ہو اور جس کی نوا سے خود زندگی کا ضمیر انھیں بے پردہ ہوتا ہوا نظر آتا ہو، اس کی عظمت کا بھلا کیا ٹھکانا ہے!

یہ تو انسان کی داستان کا وہ باب ہے جس میں فرشتے انسان کو جنّت سے رخصت کرتے ہیں، اور رخصت کرتے ہوئے خود اس کے فکر و عمل کی جولانگاہوں کی نشان دہی کرتے ہیں، لیکن اس داستان کا دوسرا باب یوں شروع ہوتا ہے کہ روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، اور یہاں جس صورت حال کا اس کو سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی تفصیل علامہؒ نے اس طرح بیان کی ہے:—

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سیمیں کی ضیا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل جو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل، کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

ان اشعار میں علامہ اقبالؒ نے انسان اور انسانی زندگی کی پوری حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں، جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے، انسانی زندگی حسین و دل آویز ہونے کے باوجود ایک ہنگامۂ محشر سے کسی طرح کم نہیں۔ اس میں ہر طرف ایک ہنگامۂ کارزار کی سی کیفیت ہے۔ انسان اس صورتِ حال کا محض ایک خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا۔ اس کو تو بہر صورت اس ہنگامۂ کارزار میں شامل ہونا پڑتا ہے، اور زندگی کے اس جدلیاتی نظام میں اپنی قوت کے جوہر دکھانے پڑتے ہیں۔ وہ تعمیر کے ایک والہانہ جذبے سے سرشار ہو کر بے خطر اس میدان میں کود پڑتا ہے اور نبرد آزما ہو کر فطرت کی تسخیر کرتا ہے۔ چنانچہ تمام مظاہرِ فطرت اس کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں اور سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ زندگی اس کے اشاروں پر چلتی ہے۔ یہی خودی کا کمال ہے۔ اور یہی

اقبالؒ کے خیال میں انسان اور انسانیت کی معراج ہے۔

علامہ اقبالؒ کا مردِ مومن یہی انسان ہے جو انسانیت اور انسانی قدروں کا علَم بردار ہے اور اس دنیا میں نیابتِ الٰہی کا مرتبہ رکھتا ہے جس کے زورِ بازو کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اور اس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ وہ محبت پر ایمان رکھتا ہے، جدوجہد اور کوشش پیہم کو اپنا نصب العین بناتا ہے، اور انسانی زندگی کے منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے کا عظیم کام انجام دیتا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کی عظمت کا راز اس کے اسی انداز کار میں مضمر ہے۔

علّامہ اقبالؒ نے اس انسان کے لیے اپنی شاعری میں بار بار مردِ مومن کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس لیے کہ وہ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں، اور اسلامی نظام کو انسان کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل اور انسانی زندگی کے لیے ایک مثالی نظام تصوّر کرتے ہیں۔ اسلامی نظام ان کے خیال میں ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ اور ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو انسان اور انسانیت کو معراج کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ اس نظام میں پرورش پانے اور زندگی بسر کرنے کی وجہ سے انسان کے اندر بے شمار چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں، اور وہ ان کے سہارے زندگی کے راستے پر آگے کی طرف بڑھتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ محبت، فراست اور جذب و شوق کی مشعلیں اس کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں، اور وہ ان مشعلوں کی روشنی میں انسانی زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں تلاش و جستجو اس کا مزاج بن جاتی ہے۔ انسانی سطح پر وہ خود کو غلامی سے آزاد کرتا ہے۔ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے گرماتا ہے، غریبوں کو خوابِ غفلت سے جگاتا ہے، کاخِ امرا کے در و دیوار ہلاتا ہے اور کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علّامہ اقبالؒ نے انقلاب کے خواب دیکھے ہیں اور اس انقلاب کے

عملی شکل دینے کے لیے اس عظیم انسان یا مردِ مومن کی شخصیت اور کردار میں زندگی اور جولانی کی بجلیاں بھری ہیں۔ لیکن اقبال کے نزدیک انسان کے لیے یہ انقلاب ذریعہ ہے نصب العین نہیں ـــــ نصب العین تو ان کے نزدیک وہ مثالی نظام اقدار ہے جس کی بنیاد، اخوت، محبت، مساوات اور سماجی انصاف پر استوار ہو، جس میں حق گوئی اور بے باکی ہو اور جس میں ہر انسان عزتِ نفس کی دولت سے مالا مال ہو کر ارتقائے انسانی کے عظیم کام کو انجام دینے میں برابر کا شریک ہو سکے۔

یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے تو علامہ اقبالؒ کے خیال میں انسان عظمت و فضیلت سے ہمکنار ہوتا ہے ـــــ وہ آسمانوں پر اڑتا ہے، ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے، ستاروں سے آگے جو جہاں ہیں، ان کی تلاش و جستجو میں محوِ کار ہوتا ہے۔ اور اس عالم میں اس کو اپنے آس پاس اور گرد و پیش اس نغمے کی گونج سنائی دیتی ہے:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اقبالؔ شاعرِ ملّت

شاعر اندر سینۂ ملّت چوں دل!
ملتے بے شاعرے انبارِ گِل!

سوز و مستی نقش بند عالمے ست
شاعری بے سوز و مستی ماتمے ست
شعر را مقصود اگر آدم گری ست
شاعری ہم وارثِ پیغمبری ست

علّامہ اقبالؒ نے ان اشعار میں نظریاتی طور پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ شاعر ملّت کے سینے میں دل کی حیثیت رکھتا ہے شاعر نہ ہو تو ملّت انبارِ گِل ہو کر رہ جاتی ہے ——— اس شاعر کے لیے سوز و مستی ضروری ہے۔ اس سوز و مستی کے بغیر شاعری ایک ماتم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ——— یہ سوز و مستی شاعر کو آدم گری سکھاتی ہے۔ اسی لیے شعر کا بنیادی مقصد آدم گری بن جاتا ہے اور یہ آدم گری شاعری کو پیغمبری کا وارث بنا دیتی ہے۔

اقبالؒ کی شاعری عملی طور پر انھیں بنیادی خیالات و نظریات کی تشریح و تفسیر ہے۔ وہ صرف ذوق نظر ہی سے عبارت نہیں۔ شے کی حقیقت کو دیکھنے کا شعور بھی اس میں موجود ہے ـــــ اس کا مقصد سوز حیات ابدی ہے اسی لیے وہ دریا کے دل متلاطم کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی بادِ سحر ہے جس سے چمن شگفتہ و شاداب ہوتا ہے۔ اس میں ضرب کلیمی کا آہنگ ہے۔ اسی لیے اس میں ایک ایسے معجزے کی شان نظر آتی ہے جس سے قوموں میں زندہ رہنے، کارہائے نمایاں کرنے، آگے بڑھنے اور ابھرنے کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ انھیں خیالات سے ان کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا مقصد اور نصب العین ہے۔ ان کے تمام جذبات، احساسات اور خیالات و افکار اسی مقصد اور نصب العین کے گرد گھومتے ہیں۔ گویا یہی اس کا بنیادی محور ہے۔

وہ صحیح معنوں میں ہمارے قومی و ملّی شاعر ہیں اور ان کی شاعری قومی و ملّی شاعری کے تمام مقتضیات کو پورا کرتی ہے۔ اس میں قوم و ملّت کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ انھوں نے اس کی پوری نغمگی کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس کے اَن گِنت معاملات و مسائل اس میں سموئے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے ان کو سلجھانے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے قومی زندگی کے حالات کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس کے ماضی و حال اور مستقبل کے مدوجزر کو اس میں کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ ہماری زندگی کا صحیح آئینہ معلوم ہوتی ہے۔ اس آئینے میں ہماری انفرادی اور اجتماعی، جذباتی اور ذہنی زندگی کے خدوخال پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری اس لحاظ سے بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے، اس میں تاریخی اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل و جزئیات موجود ہے۔ اسی لیے اس میں بڑی

زندگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ شروع سے آخر تک متحرک اور رواں دواں نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک واضح اور بلند، ایک وسیع اور ہمہ گیر پیام کا پرچم ہے ——— یہ پیام دلوں میں ولولوں اور حوصلوں کی بجلیاں بھرتا ہے اور اس کی بدولت زندگی کو سنوارنے، ماحول کو نکھارنے اور انسانی قدروں کو ابھارنے اور پھیلانے کے خیالات بیدار ہوتے ہیں۔

اقبالؒ نے سب سے پہلے اپنی شاعری کے ذریعے ہماری زندگی میں ایک سیاسی اور قومی شعور پیدا کیا۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملّت کی زبوں حالی پر خون کے آنسو ضرور بہائے لیکن صرف فغانِ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی ہی کو اپنا شعار نہیں بنالیا۔ انھوں نے اس حصار کو توڑا۔ اس سے باہر بھی نکلے اور اپنے شعور کی روشنی میں ان حالات کا جائزہ لیا جن کے سائے میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور جو ان کے آس پاس اور گرد و پیش موجود تھے۔ اقبال نے ان حالات کو دیکھا، ان کا جائزہ لیا، تجزیہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان حالات کی صحیح حقیقت ان پر آئینہ ہوگئی۔ انھوں نے ہندوستانیوں اور خصوصاً ہندی مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی، معاشی، ذہنی اور جذباتی حالت کو محسوس کیا اور انھیں قعرِ مذلّت سے نکالنے کی کوشش کی۔ حرّیت کا پیغام دیا۔ آزادی کا نغمہ سنایا۔ فرد اور جماعت کے رشتے کا سُراغ لگایا۔ اس کی اہمیت واضح کی اور ان دونوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ زندہ رہنے اور صحیح زندگی بسر کرنے کے آداب بتائے۔ نظامِ اقدار کی ناہمواری کی طرف توجہ دلائی اور ارتقاء کے راستے پر آگے بڑھنے کے لیے ایک نئے مثالی نظامِ اقدار کا تصور پیش کیا جس میں اخوت اور مساوات کے خیالات کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اس نظامِ اقدار عملی شکل دینے کے لیے ایک انقلاب کا خواب بھی دیکھا اور اس کو حقیقت بنانے کی طرف توجّہ دلائی ——— لیکن زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے وہ جذبات کے دھارے ہی پر نہیں بہہ گئے بلکہ اس سلسلے کی تمام باتوں

کو ایک فکری اور فلسفیانہ انداز میں گہرائی کے ساتھ پیش کیا۔ اسی لیے ان کے خیالات میں محض للکار کا آہنگ ہی نہیں ہے۔ غور و فکر اور سوچ بچار کے عناصر بھی موجود ہیں۔

یہ عناصر ان کی شاعری میں ہر جگہ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انھیں کی بدولت وہ ایک مکمل نظام اور لائحہ عمل سے آشنا ہوتی ہے — یہ نظام اور لائحہ عمل اسلامی ہے۔ کیونکہ اسی نظام میں انھیں انسانیت کی مادی اور روحانی ترقی اور بقا کا خیال ملتا ہے — چنانچہ اس نظام کو فروغ دینے کے لیے وہ ملت اسلامیہ کی بقا کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ یہی وہ ملت ہے جس کو از روئے وحی تعلیم دی گئی تھی۔ [illegible] کی بدولت اس کو آناً فاناً عروج حاصل ہوا تھا۔ اسی ملّت کے ضمیر میں یہ خیال موجود ہے کہ رنگ اور نسل وغیرہ کے لحاظ سے انسانوں کی تقسیم نہ کی جائے۔ قومیت اور وطنیت کے خلاف اسی نے آواز بلند کی اور اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ عربوں کے قوت و اقتدار حاصل کرنے اور ہر طرح سے غلبہ پانے پر آں حضرتؐ نے اپنے عرب ہونے پر فخر نہیں کیا بلکہ اعلان کیا کہ کسی عرب کو محض قوم و نسل کی بنا پر کسی عجمی پر فضیلت حاصل نہیں ہے اور نہ عربی کو عجمی پر کوئی تفوق ہے۔ یہ سبق بعد میں مسلمان بہت کچھ بھول گئے، لیکن اب بھی دوسری قوموں کے مقابلے میں ان میں یہ شعور بہت کچھ باقی ہے۔ نوعِ انسان کو وحدت کا عملی سبق دینے کے لیے یہ لازم ہے کہ ملّت مساوات انسانی کا اصل اسلامی نقشہ پھر بطور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ٹائن بی نے اس کا اقرار کیا ہے کہ میرے نزدیک ابھی اسلام کا وظیفہ حیات باقی ہے اور مستقبل میں بھی نوعِ انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے اس لیے کہ رنگ اور نسل اور قومیت کے تعصبات پر جس طرح اسلام اور اسلامی معاشرت غالب آئی ہے اس طرح سے کوئی اور تہذیب غالب نہیں آسکی — اقبال کے خیال میں ملّتِ اسلامی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک عالمگیر اخوت اور مساوات کی مثال پیش کر سکے۔ یہاں تک کہ اخوت اسلامی اخوت انسانی بن جائے۔

اقبال کی شاعری کی بنیاد یہی نظریہ ہے اور انھوں نے جو متنوع افکار و خیالات پیش کیے ہیں وہ سب اسی نظریے کے گرد گھومتے ہیں اور اسی نظریے کی بدولت اقبال ایک فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے عظیم نظر آتے ہیں —— ان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس کے مختلف مسائل سے منہ نہیں موڑا ہے۔ اس کے ہر مسئلے کو فکر و شعور کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اخوت و مساوات کو بنیاد بنا کر ان مسائل کو حل کرنے کا ایک واضح اور مکمل پیام دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ہمیشہ ان کی نظر انسانی زندگی کے بنیادی مسائل پر پڑی ہے۔

جب وہ یہ کہتے ہیں:

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا،
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

یا جب خضر کی زبانی اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

یا جب اس طرح للکارتے ہیں :

اٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یا جب یہ بات ذہن نشین کراتے ہیں :

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقان ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو!
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
وائے نادانی کہ محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ فروعی باتوں سے زیادہ انسانی زندگی کی بنیادی باتوں پر نظر رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں نظامِ اقدار کا پورا نقشہ ان کے سامنے ہے۔

لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے ان کے خیال میں ہر قوم کے مقامی حالات کا درست ہونا ضروری ہے اسی لیے وہ تمام فروعی جھگڑوں کو ختم کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں تاکہ آزادی کا جذبہ ان کے دلوں میں موجزن ہو۔ اقبال کی شاعری ان خیالات سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً اپنی قوم کے مخصوص حالات کو دیکھ کر انھیں قومِ فرنگ کی غلامی سے آزاد ہونے کا خیال بار بار آیا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے انقلاب کا نعرہ بھی بلند کیا ہے:

ہندیان با یک دگر آویختند فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند!
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

لیکن اس کے لیے زورِ حیدری کی ضرورت ہے جس سے ہندی مسلمان ان کے خیال میں محروم

ہو چکا ہے :

می شناسی معنیٔ کرّار چیست
این مقامے از مقاماتِ علی است
امتاں را در جہان بے ثبات
نیست ممکن جز بہ کرّاری حیات
سرگزشتِ آلِ عثماں را نگر
از فریبِ غربیاں خونیں جگر
تا زکرّاری نصیبے داشتند
در جہاں دیگر علم افراشتند
مسلمِ ہندی چرا میداں گزاشت
ہمتِ او بوئے کرّاری نداشت

انھیں اس کا صدمہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ [illegible] میں فراست اور نوجوانوں میں محبت پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ آزادی کا خیال عام ہو، اور زندگی جن شکنجوں میں کسی ہوئی ہے اس سے وہ نجات پا سکے :

اے ہمالہ اے اٹک اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر!

غرض اس طرح اقبال اپنی قومی و ملی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں۔ کوئی

معاملہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا، کسی خیال کو وہ نظر انداز نہیں کرتے - ان کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا، کسی خیال کو وہ نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور وہ ہر چیز کی اصلیت اور حقیقت کو معلوم کر کے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

اقبال کے یہاں رسم و ملت کا ایک واضح تصور موجود ہے اور انھوں نے اس کے ہر مسئلے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے - دین کو بھی انھوں نے بڑی اہمیت دی ہے لیکن اس سلسلے میں کسی تعصب اور تنگ نظری کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ دین کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے :

دیں سراپا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق و آغاز ادب
حرفِ بد را بر لب آوردن خطا است
کافر و مومن ہمہ خلق خدا است
آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیرد در پنہائے دل
دل اگر بگریزد از دل وائے دل

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کی قومی اور ملی شاعری کی بنیاد انسان دوستی اور انسانیت ہے — اور انھوں نے اس کی ایک عظیم روایت قائم کی ہے۔

اُردو میں قومی و ملی شاعری کی روایت اقبال سے پہلے بھی موجود تھی - اس کی جھلکیاں مومن

اور غالب کے یہاں بھی نظر آتی ہیں لیکن حالی اس کو ایک باقاعدہ صورت دینے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اس کے سب سے بڑے علمبردار تھے ـــــ اقبال نے حالی پر اضافہ کیا ہے اور اس میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ایک افادی اور انسانی رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے ـــــ اس طرح قومی شاعری کی روایت اقبال کے ہاتھوں تکمیل سے ہم کنار ہوئی ہے۔

اقبال کے بعد بھی قومی و ملی شاعری کے یہ اثرات ہمارے مختلف شعرا کے یہاں باقی رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہ حیثیت ایک خالص قومی اور ملی شاعر کے کوئی اور اقبال تک نہ پہنچ سکا۔ جوش ملیح آبادی نے یقیناً بعض بہت اچھی قومی اور ملی نظمیں لکھیں اور اُردو کی قومی اور شاعری کی روایت میں ان کا مرتبہ بھی خاصا بلند ہے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو صرف انھیں موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کی توجہ دوسرے موضوعات کی طرف بھی رہی۔ اس لیے ان کی قومی و ملی نظموں میں اقبال کی قومی نظموں کی سی بات نہیں ـــــ ان کے علاوہ علی اختر حیدر آبادی، سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، روش صدیقی، امین حزیں سیالکوٹی، اثر صہبائی، احسان دانش اور ساغر نظامی وغیرہ نے بھی قومی شاعری کی روایت میں اضافہ کیا ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں بھی اقبال کی قومی اور ملی نظموں کی سی گہرائی نہیں ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ اُردو میں قومی اور ملی شاعری کی روایت کو استوار کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ـــــ ان تمام شاعروں نے بھی قومی اور ملی شعور کو عام کیا۔ قومی و ملی مسائل کی ترجمانی کی اور قومی و ملی زندگی کو نئے راستوں پر گامزن کرنے میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے قومی و ملی زندگی میں انسانی قدروں کو عام کرنے کا خواب دیکھا اور اس کو بنیاد بنا کر ایسے خیالات پیش کیے جن کی نوعیت افادی تھی، اس روایت نے آگے چل کر نوجوان شاعروں کے یہاں کچھ اور صورتیں بھی اختیار کیں اور اگرچہ ان نوجوان شاعروں کے یہاں قومی و ملی شاعری کی روایت اپنی اصل صورت میں نہیں ملتی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کی جھلکیاں ان کے یہاں نظر ضرور آتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مجموعی

طور پر ان کی شاعری اب اپنے نئے جنون کے پیش نظر نئے ویرانوں کو پیدا کرنے کے لیے سرگرم نظر آتی ہے۔

یہ انھیں نوجوان شاعروں کا اثر ہے کہ موجودہ زمانے کی شاعری میں قومی و ملی شاعری کا یہ رجحان آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے — لیکن اس کے دوش بدوش اب داخلیت پسندی اور درون بینی کے اثرات جدید دور کی اردو شاعری میں اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ قومی معاملات و مسائل کی ترجمانی تو درکنار آس پاس اور گرد و پیش کے اہم سے اہم پہلوؤں کو بھی اب شاعری کا موضوع ذرا کم ہی بنایا جاتا ہے نئی نسل کے بیشتر شاعر تو آج اپنے آپ میں گم نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عام طور پر ان کی ذہنی الجھنیں پیچ در پیچ اور تہ در تہ ہو گئی ہیں۔ اُردو کے بیشتر نوجوان شاعر آج انھیں میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں بھی اس تہ در تہ اور پیچ در پیچ کیفیت کا عکس دکھائی دیتا ہے ابہام کی آج جو فراوانی اور اشاریت کا جو اتنا زور ہے اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے — یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے سامنے کوئی واضح نقطہ نظر نہیں ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بے خبر اور قومی ملی مسائل سے ناآشنا ہیں انھیں اس کا بھی علم نہیں کہ خارجی اور اجتماعی حالات کا اثر انفرادی اور داخلی زندگی پر کیا ہوتا ہے اسی لیے وہ ان دونوں کو خانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور ان کا تعلق محض انفرادی اور داخلی زندگی سے باقی رہتا ہے۔ اس صورتِ حال نے ان کی شاعری کو محدود کر دیا ہے اب تو اس میں صرف ان کی ذہنی الجھنوں کا بیان ہوتا ہے۔

حالانکہ اس وقت کی قومی و ملّی زندگی اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کو بغور دیکھا جائے۔ کیوں کہ آج کل تو اس میں مسائل ہی مسائل ہیں — ان مسائل کو دیکھنا آج کل کے شاعر کا فرض ہے تاکہ اس کو یہ اندازہ ہو کہ اس کے آس پاس اور گرد و پیش کیا ہو رہا ہے؟ کس قسم کے حالات ہیں؟ اور اب یہ حالات

کیا صورت اختیار کرنے والے ہیں۔

اقبال کے خیالات و نظریات، افکار و تصورات کو شمع راہ بنایا جائے تو جدید شاعروں کے لیے اس منزل تک رسائی آج بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔

اقبال اور تہذیبِ مغرب

علامہ اقبالؒ کی تعلیم مغربی طرز پر ہوئی۔ اسکاچ مشن سکول سیالکوٹ سے لے کر گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر کیمبرج، ہائیڈل برگ اور میونخ سب جگہ انھیں مغربی تعلیم کا ماحول ملا۔ اس کے اثرات ان کی شخصیت پر بہت گہرے ہوئے۔ انھوں نے مغرب سے بہت کچھ حاصل کیا۔ مغربی نظامِ تعلیم کو غور سے دیکھا، مغربی فلسفیوں کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا، اور اس کا اعتراف کیا کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ مغربی فلسفے کے مطالعے میں گزرا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی نگاہیں مغربی علوم کی چمک دمک سے خیرہ نہیں ہوتیں۔ برخلاف اس کے ان کے قومی اور ملّی شعور میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اور وہ مشرقی علوم، خصوصاً اسلامی فکر کی طرف زیادہ راغب ہوتے گئے۔ اور خاک مدینہ، نجف کو انھوں نے اپنی آنکھوں کے لیے سُرمہ بنالیا۔

مغربی فلسفیوں میں سے انھوں نے کانت، ہیگل، مارکس، اینگل، نٹشے، برگساں سب ہی کے مطالعے کی طرف توجہ کی، اور اس مطالعے میں اپنا خاصا وقت صرف کیا۔ ان فلسفیوں کے فلسفیانہ خیالات میں جو اچھی چیزیں تھیں۔ ان کو تو انھوں نے قبول کیا، لیکن وہ کسی فلسفی کے خاص طور پر متاثر نہ ہوئے۔ اس کی وجہ مغرب

سے کوئی بدگمانی نہیں تھی بلکہ مغرب کی تاریخ اور تہذیب کا تجزیاتی مطالعہ تھا۔ اس تاریخ اور تہذیب نے ان پر حقیقت واضح کی کہ وہ جنگوں، ہنگامہ آرائیوں، اور ظلم و ستم کی ایک داستان ہے۔ عیسائیوں کے آپس کی آویزشوں نے مغرب میں کیا کچھ نہیں دیکھا، انسانوں نے ملکوں اور قوموں کی صورتیں اختیار کر کے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا، اور ان جنگوں نے بڑی ہی بھیانک صورتیں اختیار کر لیں۔ پھر مغرب نے نوآبادیاتی نظام کو جگہ جگہ قائم کر کے انسانوں کے پیروں میں زنجیریں ڈال دیں، بیڑیاں پہنا دیں، اور ایسے مظالم کیے جو انسانیت کی تاریخ میں ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ خود مغرب میں سرمایہ و محنت کی کشمکش نے طبقاتی تفریق نے جو مناظر دکھائے اس کو انسانیت کبھی بھلا نہیں سکتی۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ پہلے فرانس اور پھر روس میں انقلابات ہوئے اور ان کے نتیجے میں دنیا ایک نئے نظام سے آشنا ہوئی۔ لیکن مادیت کا ایک طوفان اٹھا، دہریت کے خیالات عام ہونے لگے اقدار کی شکست و ریخت نے مغرب کے سارے تہذیبی نظام کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ نظریات کی جنگ شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی میں شدید کشمکش باقی رہی۔ جنگ کا خطرہ سروں پر منڈلاتا رہا، اور افراد زندگی سے بیزار نظر آنے لگے۔

علامہ اقبال نے ان تمام حالات کا مطالعہ اپنے علم کی روشنی میں کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مغرب اور اس کی تہذیب کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں، اور وہ دن دور نہیں جب وہ اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری کے ہر دور میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا:

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی برّاقی

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں،
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

○

ڈھونڈھ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنّائے خام وائے تمنّائے خام

○

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

○

پیرِ مے خانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے!

یہ چند اشعار علامہ اقبال کی غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ ان میں واضح طور پر یہ بات مختلف زاویوں سے واضح کی گئی ہے کہ مغربی تہذیب بظاہر بڑی دلآویز ہے۔ اس کی ظاہری چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اس میں تصنع زیادہ ہے۔ اس تہذیب میں دل کی خرابی اور خرد کی معموری ہے۔ اس نے جذبات کو ختم کر دیا ہے۔ عقل و خرد اس پر اس طرح حاوی ہو گئی ہے کہ لطیف انسانی کیفیات اس سے رخصت ہو گئی ہیں۔ مادیت کو اس نے اپنے اوپر سوار کر لیا ہے اور رومانیت اس تہذیب میں نام کو باقی نہیں رہی ہے۔ اس صورت حال نے زندگی کو مشین بنا دیا ہے کیونکہ وہاں صرف مشینوں کی حکمرانی ہے۔ اس سے انسان کو سکون نصیب نہیں ہو سکتا اور زندگی طمانیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب مغرب کی بنیاد مضبوط نہیں ہے۔ اس میں سطحیت ہے۔ وہ کمزور ہے۔ اس میں مسرت اور طمانیت نہیں ہے۔ صرف معمولی درجے کی عیش کوشی

ہے۔ صرف سطحی قسم کا تعیش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں مختلف طریقوں سے مدہوش ہونے اور اپنے آپ سے بے خبر ہو جانے کو زندگی کا حاصل تصوّر کر لیا گیا ہے۔

علاّمہ اقبال نے مغربی تہذیب کی اس کیفیت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ چنانچہ اپنی بعض نظموں میں انھوں نے کھل کر یہ بات کہہ دی ہے کہ تہذیبِ فرنگ فسادِ قلب و نظر ہے اور اس میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کا صحیح احساس بہت کم باقی رہ گیا ہے:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ رُوح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ رُوح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف!

اقبال پاکیزگی کے شاعر ہیں۔ بلند اخلاقی کے مفکر ہیں۔ ان کی ساری شاعری زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترجمان ہے۔ ان کا سارا فلسفہ زندگی کے ارفع معیاروں کا عکاس ہے۔ مغربی تہذیب میں انھیں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ اسی لیے وہ اس پر کڑھتے ہیں اور اس کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں تو انھوں نے صاف صاف اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ آدمیت کو فرنگ کے ہاتھوں رونا پڑا ہے اور انسانی زندگی میں سیاست فرنگ کی وجہ سے ہنگامے اور انتشار کی کیفیت رہی ہے۔ لیکن اب مشرق ایک انقلابی کیفیت سے دوچار ہے جس نے سیاستِ فرنگ کو خوار کر دیا ہے:

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ ہر جید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق — باز روشن می شود ایام شرق!
در ضمیرش انقلاب آمد پدید — شب گزشت و آفتاب آمد پدید

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد | زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برّہٗ | ہر زماں اندر کمینِ برّہٗ
مشکلاتِ حضرتِ انساں از وست | آدمیت را غمِ پنہاں از وست

در نگاہش آدمی آب و گِل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

○

اقبالؒ کے خیال میں انسان کو طمانیت صرف مادی چیزوں سے نصیب نہیں ہوتی۔ دولت اور سرمائے ہی سے روحانی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ صنعت و حرفت کی ترقی اچھی چیز ہے۔ مشینوں کا استعمال یقیناً ترقی کی علامت ہے لیکن انسان ان سے رابطہ قائم کر کے جذباتی اور ذہنی زندگی کی بے شمار مسرتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس صورتِ حال کو کس خوش اسلوبی سے بے نقاب کیا ہے۔ کہتے ہیں:

یہ عیشِ فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نُور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھویں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی

○

ان اشعار میں علامہ اقبالؒ نے بڑی ہی بلاغت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ مغربی تہذیب فنا کی طرف جا رہی ہے۔ کیونکہ ہر طرح کی ترقی کے باوجود وہاں انسان کو انسان بننا نصیب نہیں ہے۔ اس تہذیب نے انسان کو بھی مشین بنا دیا ہے۔ وہ

کل پرزوں کی طرح اپنا کام کر رہا ہے۔ صبح سے شام تک دوڑتے رہنا اس کا مقدّر ہے۔ سکون سے بیٹھنا اور روحانی کیف کا حاصل کرنا اس کے نصیب میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غیر فطری طریقوں سے اپنے ہیجان کو سکون سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن المیّہ تو یہ ہے کہ اس سے بھی اس کو سکون حاصل نہیں ہوتا اور طمانیت اسے ایک جنس نایاب معلوم ہوتی ہے۔

علّامہ اقبالؒ کے یہاں ان خیالات کے اظہار میں شدت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے آپ کو، اپنے معاشرے اور ماحول کو، اپنی قوم اور ملّت کو اس صورت حال کا شکار ہونے سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ مشرق کی رومانیت کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں، اس تہذیب میں جو اعلیٰ اور ارفع قدریں ہیں، ان کے افراد کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ زندگی صحیح راستے پر گامزن ہو۔ اس کے انھوں نے بڑے خلوص سے اکثر یہ دُعا بھی کی ہے:

○

تیرہ خاکم را سراپا نُور کن — در تجلّی ہائے خود مستور کن
تا بہ روز آرم شبِ افکارِ شرق — برفروزم سینۂ احرارِ شرق
از نوائے پختہ سازم خام را — گردشِ دیگر دہم ایّام را
فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ — از سرودِ من بگردد آب و رنگ

یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنی قوم و ملّت کے افراد کو مغربی تہذیب کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں اور اس لیے پر اس طرح خون کے آنسو بہانے لگتے ہیں:

مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود،
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی!

ترا وجود سراپا تجلّی افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

○

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ایرانی — لہو مجھکو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

علّامہ کو غم ہے تو یہی ہے کہ تہذیب مغرب، جو زندگی سے ایک فرار ہے، اس نے ہماری قوم کے افراد اور خصوصاً نوجوانوں کو تن آسان بنا دیا ہے۔ خودی ان میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کی وجہ سے ان کی حیثیت ایک ایسی نیام کی رہ گئی ہے جو زر نگار تو ضرور ہے لیکن جو بے شمشیر ہے۔ علّامہ تو اپنے ہر نوجوان کو ایک شمشیر کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ حق و باطل کی اس جنگ میں اپنے جوہر دکھا سکے جو اس وقت بھی دنیا میں جاری ہے، اور جس کے مضر اثرات سے ہر فرد پریشان حال ہے۔ ان کے خیال میں تہذیب مغرب کی کاٹ ضروری ہے۔ انھوں نے اس کے لیے اپنی شاعری سے جہاد کیا ہے اور اس کے اثرات خاطر خواہ ہوئے ہیں۔

سرور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:

> اقبال جب یورپ پہنچے تو یورپ کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ انیسویں صدی نے یورپ کو بہت کچھ دیا تھا۔ صنعتی انقلاب، میکانکی ترقی، ارتقا کے تصوّر، طاقت کے احساس نے یورپ کے افکار ذہنی پر گہرا اثر ڈالا۔ سرمایہ داری نے سامراج بنائے۔ طاقت کے احساس نے طاقت کی پرستش کا جذبہ پیدا کیا۔ ردِ عمل کے طور پر ایک نیا سماجی شعور وجود میں آیا جو اس سرمایہ دارانہ تہذیب کے خلاف تھا۔ فطرت کی تسخیر کا ایک نیا ولولہ اٹھا۔ سیاست اور اقتصادیات میں روایت پرستی کی جگہ ایک باغیانہ تصور پیدا ہوا، جس کے

اثر سے مذہب، سماج، اخلاق کوئی نہ بچ سکا۔ یہ بغاوت دو عجیب شکلوں میں ظاہر ہوئی ایک جذباتی دوسری عقلی۔ جذباتی بغاوت بائرن، شوپنہار اور نیتشے سے ہوتی ہوئی، جنگ عظیم کے جرمن تصور تک پہنچی ہے۔ عقلی بغاوت فرانس اور انگریز تجدد نوازوں سے ہوتی ہوئی مارکس اور سوویت انقلاب میں نمودار ہوتی ہے۔ یہ معمولی بات نہیں کہ اقبال شروع سے نیتشے اور برگساں سے متاثر ہوئے۔ اور آخر میں مارکس سے، یعنی ان پر جذباتی اور عقلی دونوں تحریکوں کا اثر پڑا۔"

یورپ کی ذہنی تاریخ میں نیتشے، برگساں اور مارکس کی بڑی اہمیت ہے۔ اقبال نے ان فلسفیوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور وہ کسی حد تک ان سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ طاقت کا تصور نیٹشے کی طرح ان کے ہاں بھی ہے۔ لیکن وہ نیٹشے کے تصور سے مختلف ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ انھوں نے نیٹشے کے اس تصور کو بربریت اور بہیمیت سے نکالا ہے۔ اور اسلامی آب و رنگ دے کر اس میں انسانیت پیدا کی ہے۔ فوق البشر کا تصور نیٹشے کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن اقبال کا مردِ مومن نیٹشے کے فوق البشر سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں وہ قلندری اور درویشی ہے جو اس کو انسانیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اقبال نے نیٹشے کے خیالات کی نفی کی ہے۔ اور اس کو انسانیت کے خلاف قرار دیا ہے اسی لیے اقبال نیٹشے کو "مجذوبِ فرنگی" کہتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو اقبال اس کو مقام کبریا سے آشنا کرتا۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے!

علامہ اقبال پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب مغربی تہذیب و فکر میں مارکس کے خیالات اور انقلابِ روس کے بعد اشتراکی نظام میں اس کے خیالات کو عملی صورت دینے کی

کوشش سے انھیں دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس کو انھوں نے "کلیمِ بے تجلی" اور "مسیحِ بے صلیب" کہا ہے، اور اگرچہ وہ ان کے خیال میں پیغمبر نہیں ہے لیکن اس کے پاس ایک کتاب ضرور ہے۔

آں کلیمِ بے تجلی آں مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

لیکن اس کے مادی فلسفے اور خصوصاً اس کی دہریت کو انھوں نے انسانیت کے لیے سمِ قاتل تصور کیا ہے۔ لیکن چونکہ اس کے خیالات سے مغربی تہذیب ایک انقلاب سے دوچار ہوئی ہے اور اس نے گری ہوئی انسانیت کو قعرِ مذلت سے نکال کر آسمان پر پہنچایا ہے اور بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے۔ اور طبقاتی تفریق کو مٹا کر مغرب میں ایک غیر طبقاتی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے۔ اس لیے اقبال نے اس کو سراہا ہے۔ اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ توقع بھی ظاہر کی ہے کہ آئندہ اس میں ضرور تبدیلی واقع ہوگی۔ کیونکہ ابھی تک یہ تہذیب صرف لا کی منزل میں ہے اور الا سے روشناس نہیں ہوئی۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
فکر او در تند باد لا بماند
لا سلاطین لا کلیسا لا الٰہ
مرکب خود را سوئے الّا نراند
آیدش وقتے کہ از زورِ جنوں،
خویش را زیں تند باد آید بروں
در مقامِ لانیا ساید حیات
سوئے الا ہی خرامد کائنات

غرض یہ کہ مغربی تہذیب کی مزاج دانی نے اقبال کو زندگی کے بنیادی مسائل

کی طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ کیا ہے، اور ان کے فکر و فن میں صحیح انسان دوستی کے خیالات کی لہر سی دوڑا دی ہے۔ اور انھیں صحیح معنوں میں ایک ایسا انقلابی شاعر بنا دیا ہے جو زندگی کا گہرا شعور رکھتا ہے، جس کے پیشِ نظر سرمایہ و محنت کی کشمکش کا تمام نقشہ موجود ہے، جو طبقاتی تفریق کو ختم کر کے ایک نئے نظامِ اقدار کو قائم کرنے کا خواب دیکھتا ہے اور ان تمام باتوں کو عملی شکل دینے کے لیے انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال ان کے یہ چند فارسی اشعار ہیں:

می شناسی معنیٔ کرّار چیست   ایں مقامے از مقاماتِ علی است
امتاں را در جہانِ بے ثبات   نیست ممکن جز بہ کرّاری حیات
سرگزشتِ آلِ عثمان را نگر   از فریبِ غربیاں خونیں جگر
تا ز کرّاری نصیبے داشتند   در جہاں دیگر علم افراشتند

ہندیان با یک دگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں
ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

○

ان اشعار میں مغرب اور مغربی تہذیب کی اس سفاکی کا ذکر ہے جو نو آبادیاتی نظام کی سیاست کی دین ہے، اور انیسویں اور بیسویں صدی کی تاریخ میں جس کی نہایت ہی گھناؤنی تصویریں ملتی ہیں۔ اقبال کے ہاں اس صورتِ حال کا شدید احساس ہے اور اسی احساس کی

وجہ سے انھوں نے اپنی شاعری میں مغربی تہذیب کی سفاکی کو پوری طرح بے نقاب کیا۔ اور ان کی شاعری کا یہ حصہ حد درجہ فکر انگیز اور جان دار ہے۔

مغربی تہذیب کے اشتراکی رجحان کی مزاج دانی کے زیر اثر اقبال نے بعض بڑی خوبصورت اور جان دار نظموں کی تخلیق کی ہے۔ اُردو میں ان کی نظمیں "خضر راہ" "لینن کے حضور میں" اور "ابلیس کی مجلس شُوریٰ" ایسی نظمیں ہیں جو انھیں مغربی تہذیب کا داں، ایک انقلابی مزاج مفکر اور ایک انسان دوست شاعر ثابت کرتی ہیں۔ یہ مفکر شاعر انسانیت کی پامالی اور زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتا ہے، اور ساتھ ہی انھیں بھی ہے۔ یہ اشعار عمرانی شعور سے کس درجہ معمور اور انسان دوستی کے خیالات سے لبریز ہیں:

○

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مُزدیوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکات
ساحرالموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چُن چُن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے!
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے!

(خضرِ راہ)

○

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندۂ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگاہِ رندۂ آنات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب رُوح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزّات
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیوان ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے، مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

○ (لینن خدا کے حضور میں)

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سُلطانیِٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

حق را بہ سجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے۔
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

(فرمانِ خدا، فرشتوں کا گیت)

اقبال کی شاعری میں اس قسم کے خیالات کی فراوانی ہے۔ اردو اور فارسی شاعری دونوں میں یہ خیالات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں، اور ان خیالات نے اقبال کو عظیم بنایا ہے۔ مغربی تہذیب کو انھوں نے قریب سے نہ دیکھا ہوتا، اس میں جو کشمکش ہے، اس کی صحیح اندازہ دانی انھوں نے نہ کی ہوتی، اس کے اندر جو تضادات ہیں ان کا شعور اگر انھوں نے حاصل نہ کیا ہوتا، تو ظاہر ہے کہ وہ اس قسم کے خیالات کو پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اقبال کے یہاں مشرقی اور خصوصاً اسلامی تہذیب کی عظمت کا احساس بے حد شدید تھا۔ اس احساس نے مغربی تہذیب کے صحیح خدوخال ان کے سامنے بے نقاب کر دیے اور ان دونوں تہذیبوں کے مقابلے اور موازنے نے اقبال کو فکر و شعر کی انتہائی بلندیوں سے ہم کنار کر کے صحیح معنوں میں اقبال بنا دیا۔ اس اقبال پر آج مشرق، عالمِ اسلام، انسانیت اور خود مغرب آج جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

اقبال عظیم اس لیے ہیں کہ ان کے ہاں تنگ نظری نہیں ہے۔ مغربی تہذیب اور مغربی فکر کا ان پر اثر ہے۔ کیونکہ وہاں کی روشنی علم و ہنر سے انھوں نے اپنے

آپ کو علیحدہ نہیں رکھا ہے۔ انھوں نے اس تہذیب کے اچھے اور مثبت پہلوؤں پر نظر رکھی ہے، اس سے استفادہ بھی کیا ہے لیکن وہ اس سے مرعوب نہیں ہوئے ہیں کیونکہ ان کے سامنے اسلامی اور مشرقی تہذیب کی وہ عظیم روایت موجود تھی، جس کو انھوں نے زندگی بھر عزیز رکھا، اور آخر دم تک انھوں نے اپنے فکر کے لہو سے جس کی آبیاری کی۔ ایک ایسے شخص پر، ظاہر ہے، کہ مغرب اور مغربی تہذیب کا جادو نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ نہیں ہو سکتی تھیں، کیونکہ اس نے تو خاکِ مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کے لیے سُرمہ بنالیا تھا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبال اور صنفِ لطیف

صنفِ لطیف ہمیشہ سے دُنیا کی محبُوب ترین ہستی رہی ہے اس کی ذات ہر دور اور ہر زمانہ میں موضوعِ بحث بنی رہی ہے اور قریب قریب ہر زمانہ کے ایک سے ایک بڑے فلسفی اور شاعر نے اس موضوع پر طبع آزمائی کر کے اپنے اپنے افکار پیش کیے ہیں — فلسفیوں نے فلسفہ کی گہرائیوں میں ڈوب کر اور شعراء نے رنگینیوں اور رعنائیوں کی فضا میں پرواز کر کے جہاں تک شاعروں کا تعلق ہے انھوں نے صنفِ نازک کے مسائل کا کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ہمیشہ اس کو ایک پُھول کی طرح دیکھ کر اپنے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کرنے میں محو رہے۔ انھوں نے عورت کو ہمیشہ دلچسپی ہی کا منبع سمجھا۔ ان کے خیال میں وہ ان کی محفلوں اور خلوت خانوں میں صرف کیف و سرور اور عیش و نشاط کا باعث ہی بننے کے قابل تھی۔ اس خیال نے کم از کم شعر و شاعری کی دنیا میں عورت کے اور تمام مسائل پر غور و خوض نہ ہونے دیا۔ کسی نے اس کو "سرورِ زندگی" کہہ کر اور کسی نے دنیا کی شاعری سے تعبیر کر کے اس کی شان میں قصیدہ خوانی کی۔ غرض دنیا میں صنفِ لطیف کے موضوع پر جس قدر مدح سرائی کی گئی ہے شاید ہی کسی اور موضوع پر کی گئی ہو۔

علامہ اقبالؒ نے اس کی مدح سرائی نہیں کی بلکہ اس موضوع پر غور کیا ہے۔ اور اگرچہ وہ ایک بڑے اور بہت بڑے شاعر تھے لیکن وہ عورت کے موضوع پر لکھتے وقت جذبات کے دھارے پر نہیں بہہ گئے بلکہ سنجیدگی سے اس کے تمام مسائل پر غور کیا ہے۔ اقبال کے تمام افکار و خیالات گہری فکر کا نتیجہ ہیں بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں دستِ قدرت نے شاعری اور فلسفہ کو ایک جگہ سمو دیا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری صرف جذباتی قسم کی شاعری نہیں، بلکہ عقل کی روشنی میں بڑے بڑے دقیق مسائل کی نقاب کشائی ہے۔ وہ صنفِ لطیف کے مسئلہ پر غور کرنے سے قبل ہی شعراء کی اس عام روش سے آشنا ہو چکے تھے جب انھوں نے یہ دیکھا تھا کہ ساری دنیا کے شاعروں پر اور عموماً ہندوستان کے شاعروں اور فن کاروں پر خصوصاً عورت کا جادو بری طرح اثر کر چکا ہے اور اس کے عشوہ و ناز و ادا نے انھیں زخمی کر کے دنیا کے اور کاموں کے لیے اپاہج بنا دیا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی شاعروں اور فن کاروں کی یہ روش دیکھ کر انھوں نے کہا تھا:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبال کے خیال میں صنفِ لطیف انسان کے لیے صرف ایک کھلونا ہی نہ تھی بلکہ ان کے خیال میں صنفِ لطیف کو صرف ایک تفریح کا ذریعہ سمجھنا انسان کی بہت سی صلاحیتوں کی موت ہے۔ اس لیے سب سے پہلے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ صنفِ لطیف کو صرف ایک ہی رُخ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اپنی عیش کوشیوں اور ہوس رانیوں کے لیے اس کو صرف ایک کھلونے کی حیثیت دینا ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ صنفِ لطیف اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ آیا صنفِ لطیف کی پوزیشن ہمارے معاشرے میں کیا ہونی چاہیے؟ صنفِ لطیف کو آزاد

رہنا چاہیے یا مرد کا غلام ؟ صنفِ لطیف کے لیے تعلیم مناسب ہے یا نہیں ؟ صنفِ لطیف کی حفاظت میں قوموں کا کیا حصّہ ہے ؟ اقبال نے انھیں سوالات کے جوابات اپنے مخصوص انداز میں دیے ہیں اور بتایا ہے کہ صنفِ لطیف صرف انسان کی تفریح کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ قوموں اور ملّتوں کی تعمیر میں اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں اور لیے جانے چاہییں۔

اقبال نے دیکھا کہ صدیوں سے ہر دور میں صنفِ لطیف کے مسائل پر غور و خوض ہوتا رہا ہے لیکن کوئی بھی اس کے مسائل کو پوری طرح حل نہیں کر سکا ہے آج بھی صنفِ لطیف کے مسائل کم و بیش وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے تھے لیکن اس میں صنفِ لطیف کا کوئی قصور نہیں وہ تو بے بس ہے اور ہمیشہ بے بس رہی ہے۔ یورپ اور دوسرے مغربی ممالک میں جو آزادی عورت کو حال میں نصیب ہوئی ہے وہ بھی نہ تو خود عورت نے اپنی کوشش سے حاصل کی ہے اور نہ مرد اس کو دینا چاہتا ہے بلکہ وہ تو اس معاشرے کے ایک دھارے کی کارفرمائی ہے جو تیزی کے ساتھ نہ صرف عورت کو بلکہ تمام اصناف و افراد کو قعرِ ہلاکت کی طرف تیزی سے سمیٹے لیے جا رہا ہے اور انسان بے چارے لاچار اور بے بس ہو کر اس کے ساتھ بہہ جانے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں وہ اپنے سامنے بھیانک تاریکیاں اور موت کے مہیب اور خون آلود جبڑے کھلے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی کچھ کر نہیں سکتے۔ ان کی وہ حالت ہے جو کسی پہ آپے سے باہر ہو جانے کے بعد طاری ہوتی ہے۔ مرد آج تک عورت کو سمجھ نہیں سکا۔ یہ بھی اسی معاشرت کا طفیل ہے :

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

(مردِ فرنگ)

اور اس معاشرت کے طفیل صنفِ لطیف آج ان فضاؤں میں پرواز کر رہی ہے جہاں پہنچنے کا خیال اس کو کبھی چھو بھی نہیں گیا تھا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے مغربی ممالک میں زیادہ انسانوں کی زندگیاں آج وبال جان بن چکی ہیں۔ وہاں کے مرد و عورت اس طرح مل جل کر نہیں رہ سکتے جس سے انھیں ایک رُوحانی خوشی حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگیوں میں ایک قسم کا انتشار اور بے چینی ہے، جوان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے لیے گھن کا کام کر رہا ہے۔ ان کی بنیاد اندر ہی اندر کمزور ہو رہی ہے عورت کا حال یہ ہے کہ اس کو اولاد سے نفرت ہو چکی ہے حالانکہ عورت کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اچھی اولاد پیدا کرے اور اچھی طرح ان کی تربیت کرے لیکن مغربی عورت نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے اور مرد بن جانے کی ہوس میں اس نے اپنی ساری نسوانی خوبیوں کو بھی گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے کسی قوم اور ملک میں اچھی اولاد کا پیدا نہ ہونا اس کی بربادی اور تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک میں ایک انحطاط کی کیفیت ہے ایک مستقل انحطاط۔ کون جانے کہ آیندہ ہزار دو ہزار سال میں یورپ کی آبادی کی کیا شکل ہو۔ اقبال یوں تو ساری معاشرت سے نفرت کرتے ہیں اور اپنے اس خیال کو انھوں نے بیسیوں جگہ پیش کیا ہے۔ لیکن عورت کی اس حالت کو وہ بہت ہی افسوسناک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کو سرزنش کرتے ہیں اور مشرقی ممالک کو جو بھی

تک اس شعلے کی گرفت سے محفوظ ہیں اس سے دامن بچانے کا پیغام دیتے ہیں ان کے خیال میں مغربی معاشرت کی یہ کیفیت ایک قسم کی خودکشی ہے۔ ایک انسان یا دو انسانوں کی خودکشی نہیں بلکہ قوموں اور نسلوں کی خودکشی ہے:

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

(ایک سوال)

اگرچہ مشرق میں بھی کچھ لوگ یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں لیکن پھر بھی وہ ابھی اس بدعت سے کوسوں دور ہیں۔ اور اقبال کا خیال ہے کہ وہ جس قدر بھی اس ہلاکت آفریں طوفان سے اپنے دامن کو بچا سکیں اسی قدر بہتر ہے۔

صنفِ لطیف کو آزادی ملنی چاہیے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر بہت کچھ غور کیا جا چکا ہے لیکن آج تک اس گتھی کو کوئی پورے طور پر سلجھا نہیں سکا ہے بعضوں کا خیال ہے کہ عورت کو پوری طرح آزاد ہونا چاہیے اس کے ساتھ مرد کا یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس نے آج سے نہیں بلکہ ازل سے اس کو ایک آہنی زنجیر پہنا رکھی ہے۔ عورت کو بھی معاشرے میں وہی مرتبہ حاصل ہونا چاہیے جو مرد کو حاصل ہے۔ برخلاف اس کے بعض اس طرح سوچتے ہیں کہ صنفِ لطیف کو آزادی دینے سے ساری دنیا کی معاشرت میں ایک انتشار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے مناسب نہیں کہ عورت آزاد ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اس پر بہت سوچ بچار کے بعد رائے زنی کی ضرورت ہے۔ اقبال نے بہت عمدہ طریقہ سے اس موضوع کو پیش کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے بہتر طریقہ اس موضوع پر

قلم اٹھانے کا ہو ہی نہیں سکتا۔ کہتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ اس معاملہ میں اقبال کا نظریہ کیا تھا!۔ بہرحال اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ مرد کو عورت پر برتری دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ قوم اور ملت کے مردوں کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت کریں۔ یہ خیال کہ عورت اپنی حفاظت بذات خود علم کا ہتھیار ہاتھ میں لے کر کر سکتی ہے ان کے نزدیک ایک مہمل سی بات ہے۔ ان کے خیال میں جس قوم نے عورت کی حفاظت کو اپنا فریضہ نہیں بنایا اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے عروج کا آفتاب ادبار کی اندھیاریوں میں چھپ گیا۔

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

(عورت کی حفاظت)

غرض یہ کہ اقبال مرد کو عورت پر برتری دیتے ہیں وہ اس کی اس غلامی اور "پابہ زنجیری" پر بھی کڑھتے ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ مرد کے سایہ میں پھلے پھولے۔ وہیں اس کی زندگی کا گلشن پُر بہار ہو۔ لیکن اقبال نے اس معاملے میں کوئی صاف بات نہیں کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس گتھی کا سلجھانا خاصا مشکل معلوم ہوتا ہے اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو حقیقتاً ہے بھی بہت مشکل۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں:

میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدہ مشکل کی کشود!

عورت کو تعلیم دینی چاہیے یا نہیں؟ اقبال نے اس پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت کو اعلیٰ تعلیم دینی چاہیے کیونکہ بغیر تعلیم کے اس کی فطری صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں اور وہ چشمے خشک رہتے ہیں جن سے عقل و دانش کی کھیتی سیراب ہوتی ہے۔ عموماً جدید لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عورت کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور اس میدان میں مردوں کے دوش بدوش چلے، لیکن بعض ان جدید لوگوں میں بھی ایسے ہیں جو اس نظریے کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں عورت کو اعلیٰ تعلیم دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ علم حاصل کرنے سے عورت میں غیر معمولی سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی ہر چیز میں بال کی کھال نکالنے کی کوشش اس کی نسوانیت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اقبال کے خیال میں عورت کو تعلیم تو دی جا سکتی ہے لیکن اس کو ایسی تعلیم دینا جس سے وہ نسوانیت کی تمام خوبیوں سے محروم ہو جائے ایک غیر معقول بات ہے نسوانیت عورت کا جوہر ہے نسوانیت ختم ہوتے ہی گویا اس کی موت آجاتی ہے اور وہ اس کے بعد

جو کچھ بھی رہے عورت نہیں رہتی۔ وہ ایسی تعلیم کے سخت مخالف ہیں جو عورت کو مرد بننے کے لیے اکساتی ہے اور نسوانیت کو گلا گھونٹ کر مار دینے کا پیغام دیتی ہے۔ وہ عورت کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس سے وہ دین سے بے گانہ نہ ہو۔ اقبال کے خیال میں انسانیت کے لیے سب سے بڑی اور ضروری چیز دین ہی ہے اور اگر عورت ہی دین سے بے گانہ ہو گئی تو پھر اس کی آغوش میں پرورش یافتہ اولاد بھی دین و مذہب سے برگشتہ ہو گی۔ اور نتیجہ یہ ہو گا کہ ہستی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ دین و مذہب ایک ایسی شمع فروزاں ہے جس کی روشنی میں انسان زندگی کی پُر پیچ اور تاریک راہوں پر آگے بڑھتا ہے اور اسی کے باعث اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلوں تق و دق صحراؤں بنجر اور روح کش ریگستانوں کو عبور کرتا ہوا اپنی منزل مقصود پر پہونچنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اس کے بغیر منزل پر پہنچنا محال ہے۔ یورپ نے اپنی عورت کو تعلیم دی اور ایسی تعلیم دی جس نے اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا۔ اور وہ صحیح معنوں میں عورت نہ رہی۔ وہاں کی عورتوں نے مرد بننے کی تمنا میں وہ کچھ کیا جو انسانیت کے خوشنما چہرے پر ایک بدنما داغ ہے اقبال عورت اور تعلیم میں کہتے ہیں۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرتِ انسان کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نا زن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

(عورت اور تعلیم)

اقبال کے خیال میں صنفِ لطیف کے لیے محبت سب سے بڑا جوہر ہے اور جو تعلیم

اس کو دین سے بے گانہ کر دیتی ہے وہ عشق و محبت کے گلے پر چھری چلائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی پس عورت کی تعلیم میں دین ایک لازمی چیز ہے۔ عورت کی اس تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ اس کا سب سے بڑا فریضہ اچھی اولاد پیدا کرنا اور اس کی پرورش اس طرح کرنا ہے کہ وہ بڑھ کر قوم و ملت کے لیے کارآمد افراد ثابت ہوں۔ عورت کو عالم بننے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس بات کی ہے۔ سقراط و افلاطون بن جانا عورت کے لیے اتنا زیب نہیں دیتا جتنا کہ سقراط و افلاطون کا پیدا اور پرورش کرنا ان کے نزدیک عورت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کے بطن سے سقراط و افلاطون کی ایسی ہستیاں پیدا ہوں اور دنیا میں کارہائے نمایاں کریں۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

(عورت)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے نظریہ میں گہرائی اور وسعت ہے وہ سطحی باتوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ حقائق کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے خیالات کی نشر و اشاعت کرتے ہیں جو بنی نوعِ انسان کے لیے کسی نہ کسی طرح مفید ثابت ہو۔ وہ وقتی کیف کے دلدادہ نہیں بلکہ افادیت کے پرستار ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عورت کو کبھی بھی کیف و شعر نہیں سمجھا۔ ان کی ساری شاعری قریب قریب رومان کا فقدان ہے۔ چنانچہ وہ فن رقص و نغمہ کو بھی اچھا نہیں سمجھتے موجودہ تہذیب نے رقص و موسیقی کو جو مناسبت عورت سے دے رکھی ہے اقبال اس کے مخالف ہیں وہ صنف لطیف کو تھیٹر، سینما اور دوسری محفلوں میں اپنے بدن کے خم و پیچ کی نمائش کرتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتے بلکہ اس کو مخرب اخلاق اور قوموں کے افراد کی فلاح و بہبود کے منافی خیال کرتے ہیں ان کے خیال میں دستِ قدرت نے عورت کو اس لیے تخلیق نہیں کیا کہ وہ جگہ جگہ بے حیائی کی نقاب ڈال کر اپنے عشووں اور ناز و انداز سے لوگوں کا دل لبھاتی پھرے وہ شمع شبستان دل بن سکتی ہے۔ وہ ایسے آرٹ کے خون کر دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے جو عورت میں بے حیائی پیدا کرے اور اس طرح اس کے سب سے بڑے جوہر کا خون ہو۔ چنانچہ ان کے نزدیک بدن کے خم و پیچ سے جو رقص اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے جو نغمہ پیدا ہوتا ہے وہ کوئی بڑی قیمت نہیں رکھتا۔ وہ تو اس کی تمنا رکھتے ہیں کہ انسان اپنی روح میں روحِ موسیقی پیدا کرے اور اس کو رقص کا پیغام دے وہ یورپ اور اس کی معاشرت سے اسی وجہ سے متنفر ہیں کہ اس نے روح کو رقص و موسیقی سے روشناس نہیں کرایا بلکہ وہاں کی تمام مخلوق جسمانی راحتوں کے کیف و سرور میں کھو گئی۔ اقبال ایسے کیف و سرور کو اچھا نہیں سمجھتے وہ تو ایسے سرور کے قائل ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ انسان کے دل میں برقرار رہے اور رُوح کو بالیدگی عطا کرتا رہے جسمانی کیف و سرور تو صرف چند لمحوں میں انسان کو تھوڑی سی لذت دے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ مشرق والوں کو پکار کر کہتے ہیں:

چھوڑ یورپ کے لیے رقص و بدن کے خم و پیچ
رُوح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی

صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

(رقص)

اقبال کے اس خیال سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ انھیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہوگا کہ رقص و سرود کا خون نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی زندگی کے لیے ان کا وجود بھی لازمی ہے۔ لیکن انھیں اقبال اور ان کے پیش کیے ہوئے خیالات کو دیکھتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اقبال کے پیش نظر ایک وقتی کیف و سرور کبھی بھی نہیں رہا۔ وہ تو شاہین بن کر پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بس ایک ایسے انسان سے جو زندگی کو ایک مستقل جد و جہد، ایک مستقل جدال و پیکار سمجھتا ہو، اس بات کی توقع کرنی ہی فضول ہے کہ وہ کسی جسمانی اور وقتی کیف و سرور کا حامل ہو اور نہ پھر وہ کیف و سرور جو صنفِ نازک کی نسوانیت کا خون کر کے وجود میں آئے جس کی بنیادیں بے حیائی پر رکھی جائیں۔ اقبال عورت کو میدانِ جنگ میں سپاہی کی طرح لڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے ان کے خیال میں صنفِ لطیف کے لیے شمشیرِ آبدار مناسب نہیں بلکہ اس کو چراغِ خانہ ہونا زیادہ زیب دیتا ہے۔ لیکن اگر وقت آن پڑے تو عورتیں میدانِ جنگ میں لڑنے کے علاوہ دوسرے کام انجام دے سکتی ہیں جن سے لڑنے والوں کو سہولت ہو اور انھیں سہارا مل سکے۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ایک نظم فاطمہ بنت عبداللہ، ایک عرب لڑکی پر لکھی تھی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی تھی۔ اس نظم میں علامہ مرحوم نے فاطمہ اس کے کام اور اس کے جذبہ کو بہت سراہا تھا۔ اس نظم سے اقبال کے ان خیالات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے جو وہ عورت اور میدانِ جنگ کے بارے میں رکھتے تھے۔ فاطمہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

فاطمہ تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں
فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
جو ابھی اُبھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی تو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

(فاطمہ بنتِ عبداللہ)

صنفِ لطیف کے لیے پردے کو اقبال کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور جب پردہ کے متعلق سوچتے اور غور کرتے ہیں تو ان کا خیال بہت گہرائی میں پہونچ جاتا ہے اور وہ پردے کی بحث کو ایک معمولی اور غیر ضروری چیز سمجھ کر خودی کے مسئلہ کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں پردے سے کوئی نتیجہ نہیں۔ وہ مشرق کے مرد و عورت میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں یہاں کے مرد و عورت دونوں خلوت میں رہے ہیں۔ ان کی خودی ابھی تک بے نقاب نہیں ہوئی۔ پردے کی بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی خودی کو بے نقاب کر دیں تاکہ دُنیا دیکھ سکے کہ وہ بھی کچھ ہیں ورنہ مرد و زن برابر ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ اقبال کے اس خیال سے اس امر کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ پردے اور ہندوستان کے مروجہ پردے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اس معاملہ میں زیادہ روشن خیال معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں پردے کا موجودہ طریقہ ٹھیک نہیں اور نہ ہی پردے کے متعلق بحث و مباحثہ سے کچھ حاصل ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ایسا پردہ قوم کی فلاح و بہبود کے منافی ہے۔

بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے
خدایا یہ دُنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے یہ خلوت نشیں ہے

ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم،
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے!

(پردہ)

غرض یہ کہ علامہ اقبالؒ کا تصوّر صنفِ لطیف ان کے فلسفے، فکر اور پیغام کا حصّہ ہے۔ انھوں نے اس کو صرف دلچسپی اور عیش کوشی کا ذریعہ نہیں سمجھا ہے بلکہ معاشرے میں اس کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس کو محض ایک کھلونا ہی تصوّر نہیں کیا ہے بلکہ معاشرے میں اس کو ایک اہم حیثیت دی ہے کیونکہ وہ بھی زندگی کو بہتر بنانے اس کو سنوارنے اور نکھارنے میں مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو بھی ان تمام منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے جو انسان کو انسان کامل بناتی ہیں۔ اور جن سے آشنا ہوتے بغیر وہ مردِ مومن نہیں بن سکتا۔

اقبال کی غزل

اقبالؒ غزل کے بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو برتا ہی نہیں، اس کو نئی زندگی سے بھی آشنا کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس میں نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں غزل کی روایت میں ایک انقلابی تبدیلی کا عکس نظر آتا ہے۔ اقبال نے اس میں بڑی وسعت پیدا کی ہے۔ اس وسعت کا احساس موضوع اور خیال میں بھی ہوتا ہے اور اظہار و بیان بھی۔ اقبال کی غزل کے موضوعات بالکل نئے ہیں۔ اگرچہ بہ ظاہر ان میں حسن و عشق اور اس کے تمام معاملات کا تذکرہ ہے لیکن حسن و عشق اور اور اس سلسلے کی ساری تفصیل اقبال کے یہاں کچھ اور معذرت رکھتی ہے۔ انھوں نے ان غزلوں میں اپنے سارے فلسفے کو سمو دیا ہے۔ ان کے اساسی نظریات ان غزلوں میں پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان موضوعات کی نوعیت فلسفیانہ ہے۔ لیکن اقبال کا فلسفہ چونکہ محض فلسفہ نہیں ہے۔ عمرانیات سے بھی اس کا قریبی ربط ہے اس لیے اقبال کی غزلوں میں بھی یہ فلسفہ، عمرانی مسائل کا مفکرانہ اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے ان موضوعات میں وسعت اور گہرائی ہے۔ اس لیے ان کو پیش کرنے میں بھی انھیں اظہار و بیان کی وسعت اور گہرائی کا خیال اپنے پیشِ نظر رکھنا پڑا ہے۔ اس سلسلے میں

ایک تو انھوں نے غزل کی روایت میں جو مروجہ اشارے ہیں ان سے کام لیا ہے اور دوسرے کچھ نئے اشارے وضع بھی کیے ہیں اور ان دونوں کی آمیزش سے ایک اچھا خاصا نگارخانہ تیار کر لیا ہے۔ اس لیے جو معنویت اقبال کی غزلوں میں ملتی ہے، موجودہ دور میں کسی اور کے یہاں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اقبال پر ابتدا میں روایت کے اثرات بڑے گہرے تھے اور وہ روایتی انداز میں غزلیں کہتے بھی تھے لیکن جیسے جیسے ان کا شعور بڑھتا گیا، اس میں تبدیلی ہوتی گئی، اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال نے ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ پیدا کر لیا اس سے اُردو غزل کی روایت میں وسعت پیدا ہوئی۔ "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" دونوں میں جو غزلیں شامل ہیں وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ صرف چند اشعار اس حقیقت کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گے ؎

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لیے

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

دلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
ترا لاعشق ہے میرا، ترالے میرے نالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

ملا ہمت کا سوز مجھ کو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل — یہی ہے فصلِ بہاری؟ یہی ہے بادِ مراد؟
خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ — وہ ادب گہِ محبت، وہ نگہ کا تازیانہ
یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ
نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت — یہ جہان ہے نہ قفس نہ آشیانہ
رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی — کہ عجم کے مے کدوں میں نہ رہی مئے مغانہ
مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے — انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا — نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے
اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر — کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن — نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

وہ مرغزار کہ بیمِ خزاں نہیں جس میں — غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

○

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نم ناک

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منّتِ تاک

○

گدائے مے کدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ گیا کہ چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو
میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہے اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہِ بے قابو

○

اِن اشعار میں نئی معنویت ہے۔ نیا شعور ہے۔ نیا احساس ہے۔ نیا فلسفیانہ زاویہ نظر ہے۔ نیا نظریۂ حیات ہے۔ اس لیے بہ اعتبار مضامین ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے لیکن ان مضامین کو پیش کرنے کا جو انداز ان اشعار میں اختیار کیا گیا ہے وہ اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اشعار باوجود اپنی نئی معنویت کے بہرصورت غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں غزل کی روایت کا عکس بہت واضح ہے۔ بیش تر ان میں وہی اشارے اور علامتیں ہیں جو غزل کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں لیکن اقبال کی نئی معنویت نے ان اشاروں اور علامتوں میں نئی زندگی دوڑا دی ہے اور اس زندگی نے ان کے اندر ایک توانائی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ یہ توانائی اقبال کی غزلوں میں ہر جگہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔۔۔۔ لیکن اقبال نے انھیں اشاروں اور علامتوں تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا۔ ان کی نئی معنویت اس راہ پر انھیں بہت آگے بھی لے گئی ہے اور انھوں نے اشاروں اور علامتوں کے کچھ نئے پیکر بھی تراشے ہیں۔ اور ان نئے پیکروں نے اظہار و بیان کے

نئے پہلوؤں کو پیدا کیا ہے۔ اس طرح اقبال نے غزل کی روایت میں وہ وسعت پیدا کر دی ہے جس کے نہ ہونے کا غالب تک کو شکوہ تھا۔

اقبال اسی لیے تمام غزل گو شعراء سے الگ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو بعض بڑے اہم تجربات سے آشنا کیا ہے اور ان تجربات نے غزل کو زندگی اور فن کے نئے سے نئے اُفق پر پرواز سکھائی ہے

---

(۲)

اقبال نے غزل کو جدّت سے ہم کنار کرنے کا بڑا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے غزل میں اپنے عہد کے مختلف مسائل کی ترجمانی ہی نہیں کی ہے، غزل کو ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ بھی دیا ہے۔ روایتی علامتوں اور اشاروں کے ساتھ انھوں نے اپنی مخصوص علامتیں اور اشارے بھی وضع کیے۔ اور ان میں اثر کا سحر بھی پیدا کیا۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ ان کی اس خصوصیت نے غزل کو بہت وسیع کیا اور اس طرح آئندہ نئے تجربات کے لیے ایک فضا قائم ہوئی۔ غزل کو جدید بنانے میں یہ فضا بڑا دخل رکھتی ہے۔

اقبال داغ کے شاگرد تھے لیکن ان پر داغ کے تغزّل کا ذرا بھی اثر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اقبال داغ کی طبیعت اور ان کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ جن حالات سے انھیں دوچار ہونا پڑا اور جو حالات خود انھوں نے پیدا کیے وہ داغ کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اقبال کو ابتدا میں روایتی ماحول ملا اور وہ ایک حد تک اس کے زیر اثر آ بھی گئے، لیکن یہ اثر زیادہ عرصے باقی نہیں رہا کیونکہ زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیت نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی، اور انھوں جلد ہی اپنا زاویہ نظر قومی اور ملی بنا لیا۔ انھوں نے سیاست کو بہت قریب سے دیکھا۔ وطنیت کی تحریک کے

گہرے اثرات بھی انھوں نے قبول کیے۔ لیکن مسلمانوں کا خیال اور ملت کا احساس ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکا۔ اور کچھ وقت گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اسی قومی اور ملی اصلاح کے لیے وقف کر دیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی حالت کو محسوس کیا۔ ان کی زبوں حالی کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اسلامی روایات کی عظمت اور بلندی کو اپنے پیشِ نظر رکھا۔ اور پھر اس طرح کے خیالات پیدا کیے کہ مسلمان انحطاط اور زوال کے چکّر سے باہر نکل سکتے ہیں لیکن اس کے لیے عمل کی ضرورت ہے۔ خودی اور خودداری کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے بازوؤں میں طاقت کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک والہانہ جذبہ اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی ان کے نزدیک عشق ہے۔ ان کے عشق کی نوعیت قومی اور ملی ہے------ یہ عشق انسان کی زندگی کے لیے ضروری اور لازمی ہے کیوں کہ اس کے بغیر وہ صحیح معنوں میں انسان نہیں بن سکتا۔

یہ خیالات و نظریات اقبال کی ساری شاعری میں نمایاں ہیں۔ ان کی غزلیں بھی ان سے بچ نہیں سکی ہیں۔ انھیں خیالات و نظریات کی ترجمانی اور عکاسی ہے۔ "بانگِ درا" میں ان کی چند ہی غزلیں شامل ہیں۔ وہ غزلیں ابتدائی دور کی ہیں لیکن ان میں بھی روایتی موضوعات ترجمانی نہیں ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں جذبے کی شدت ہے لیکن جذبے کی نوعیت قومی اور ملی ہے جس میں اصلاح کا رنگ غالب ہے۔ ان غزلوں میں اقبال نے بڑا رچا ہوا انداز پیدا کیا ہے۔ اور وہ مقتضیات غزل کے گہرے شعور کا نتیجہ ہے۔ ان غزلوں میں اقبال نے غزل کی روایات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ لیکن یہ اس بات کا احساس بھی دلاتی ہیں کہ اقبال غزل کے لیے نئے میدان کو تلاش بھی کر رہے ہیں۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا:

یہ موجِ پریشان خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا   ہے دور وصالِ بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس حجابِ محمل سے
محمل جو گیا، عزت بھی گئی غیرت بھی گئی لیلیٰ بھی گئی

کی ترک تگ و دو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکشِ دریا بھی گئی

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

○

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بیہوش ہے

آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں
پہلوئے انسان میں اک ہنگامہ خاموش ہے

○

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناریٔ بت خانۂ ایام ابھی

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

○

بے تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

○

پھر فصلِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو گل ہے تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹھی ہے، اجزا کی حرارت سے
برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو
اے رہروِ فرزانہ! رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو
ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گرِ ساماں ہو

○

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں نہ مری حدیثِ گداز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

○

اقبال کی ان غزلوں سے اُردو غزل میں ایک ایسی جدّت پیدا ہوتی ہے جس کا اس سے قبل اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اقبال نے ان غزلوں میں اپنے افکار و خیالات کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں ان غزلوں کے اشعار میں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ان میں غزل کی قدیم روایت کا ایک رچا ہوا شعور کارفرما ہے۔ لیکن ان قدیم روایات کو برتنے میں اقبال نے کچھ ایسی جدتیں کی ہیں جو ان سے قبل اردو غزل میں باوجود ان تجربات کے نظر نہیں آئیں جن کا ایک سلسلہ غالب اور حالی کے زمانے سے اس میں ملتا ہے۔ اقبال نے ان غزلوں میں غزل کے روایتی علامتوں اور اشاروں میں نئے مفاہیم کو سمونے

کی کوشش کی ہے۔ ان کے مختلف اشعار میں ایک ہلکے سے تسلسل کا احساس بھی ہوتا ہے اقبال کی بڑائی کا احساس اس میں ہے کہ وہ باوجود ان جدتوں کے غزل کے آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے۔ برخلاف اس کے ان تمام باتوں کے باوجود ان کی غزل میں غزل کی خصوصیات باقی رہتی ہیں۔

غزل میں اقبال کے یہ تجربات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتے۔ آگے چل کر اقبال کی غزل کو بالکل ہی ایک نئے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ ان کے فکر کی ارتقائی کیفیت انھیں ایسا کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ "بالِ جبریل" میں اقبال کی جو غزلیں موجود ہیں ان میں بالکل ایک نیا انداز اور نیا آہنگ ہے۔ ان میں بھی غزل کی مروجہ روایات کا استعمال کہیں کہیں ہوا ہے۔ لیکن نسبتاً اب اس کے اثرات کم نظر آتے ہیں۔ اب اقبال نئی روایات کی تشکیل کرتے ہیں۔ نئی علامتیں، نئے اشارے، نیا طرزِ اظہار ان غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہیں۔ ان کے موضوعات میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ وہ ساری زندگی پر حاوی ہیں۔ اقبال جو کچھ بھی سوچ سکتے تھے، جو بھی ان کے بنیادی خیالات و نظریات تھے ان سب کو انھوں نے ان غزلوں میں سمو دیا ہے۔ چند غزلوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

○

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تابدار کر!
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر!
عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہ وار کر

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

○

وہی میری کم نصیبی وہی میری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی !

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں لامکاں ہے
یہ جہاں ترا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

اسی کشمکش میں گزری مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہ بازی

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

○

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹتا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کاروں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
کہ گئیں رازِ محبت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

○

ان غزلوں میں نئے افکار و خیالات ہیں۔ نئے تصوّرات ہیں۔ ان میں ایک نئی زندگی اور زندگی کے ایک نئے زاویے نظر کی ترجمانی ہے اور ان سب کو پیش کرنے والے کی شخصیت، ان کے شدید احساس کی حامل ہے۔ اس نے ان سب کو اپنی شخصیت ایک لازمی جزو بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افکار و خیالات کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ چنانچہ یہ معنوی وسعت ہی اس کے طرزِ اظہار میں بھی وسعت پیدا کرتی ہے اور اس طرح ان غزلوں میں جس جدّت کا وجود ہوتا ہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔

خضرِ راہ

علامہ اقبالؒ کی نظموں میں خضرِ راہ ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے آئینے میں ان کے بنیادی خیالات اور سیاسی نظریات پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں انہوں نے جو کچھ سوچا ہے، سلطنت کے متعلق انہوں نے جو خیالات قائم کئے ہیں، سرمایہ و محنت کی کش مکش کو انہوں نے جس طرح محسوس کیا ہے، دنیائے اسلام کی حالت کو دیکھ کر جو کچھ ان پر بیتی ہے، ان سب کو انہوں نے اس نظم میں خضر کی زبانی بیان کیا ہے، اور اس سلسلے میں بعض بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ان باتوں کی تہ میں ان کی انسان دوستی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ زندگی کی تباہی، انسانیت کی زبوں حالی، نظامِ اقدار کی ناہمواری کا نقشہ انہیں پریشان کرتا ہے اور وہ ان سب کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نظم میں ایک واضح پیام بھی ملتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو علامہ اقبال نے سیدھے سادے لیکن بڑے ہی دل موہ لینے والے انداز میں پیش کیا ہے جس کی وجہ سے یہ نظم فنِ شاعری کا ایک شاہکار بن گئی ہے۔ اسی لئے اقبال کی چند اہم نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

نظم کا آغاز اس اضطراب اور بے چینی کے اظہار سے ہوتا ہے جس میں شاعر مبتلا ہے

اس اضطراب اور بے چینی کے عالم میں وہ ساحل دریا پر گھومتا پھرتا ہے۔ اس کے دل میں اضطراب کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے جو اس کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔ رات کی تاریکیاں حد نظر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دور دور تک خاموشی کا بسیرا ہے۔ دریا نرم سیر ہے۔ مرغ مضطر کہیں گہرائیوں میں مست خواب ہیں۔ رات کا افسوں اپنے شباب پر ہے، اور اس افسوں سے طاہر آشیانوں میں اسیر ہیں۔ اس عالم میں شاعر اپنے اضطراب کو کم کرنے کی غرض سے دریا کی طرف جا نکلتا ہے۔ یہیں اس کی ملاقات خضر سے ہوتی ہے اس کا دل ہنگاموں کی آماجگاہ ہے۔ وہ جستجو کی راہ کا مسافر ہے۔ اس لئے خضر کو دیکھ کر اس کے دل میں نہ جانے کیا کیا خواہشیں بیدار ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ اس موقع کو غنیمت جان کر خضر سے گفتگو میں مصروف ہو جاتا ہے اور بے شمار سوالات کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا اور اپنی طبیعت کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے۔ یہ سوالات موجودہ دور کی زندگی کے ان معاملات و مسائل سے تعلق رکھتے ہیں جن سے وہ دوچار ہے۔ شاعر خضر سے پوچھتا ہے کہ زندگی کا راز کیا ہے؟ وہ کیوں وجود میں آئی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے اس زندگی میں سلطنتیں ہیں، حکومتیں ہیں۔ یہ سلطنتیں اور حکومتیں کیا چیز ہیں؟ ان میں ہنگامہ کیوں نظر آتا ہے؟ سرمایہ و محنت کی کشمکش ان میں کیوں جاری ہے؟ ملوکیت کیوں دنیا پر قبضہ کرنا چاہتی ہے؟ ایشیا کا خرقہ دیرینہ کیوں چاک ہو رہا ہے؟ اور اس کی روایات کیوں خاک میں مل رہی ہیں؟ عالم اسلام کا کیوں بُرا حال ہے؟ ہاشمی دین مصطفی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیوں بیچ رہا ہے؟ کیا زندگی پھر کسی کا امتحان لینا چاہتی ہے؟ ظاہر ہے کہ زندگی ہمیشہ ہمیشہ اسی عالم میں نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کیا یہ حالات کسی انقلاب کا پیش خیمہ تو نہیں ہیں؟

یہ اشعار ان تمام سوالوں کے ترجمان ہیں جو شاعر کی زبان پر آتے ہیں اور جو شاعر کی زبان پر نہیں آتے لیکن جو اس کے دل و دماغ میں ایک ہنگامہ محشر برپا کئے ہوئے

ہیں۔ ؎

زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایۂ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجوان اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش۔
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰؐ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟

خضر ان تمام سوالوں کو غور سے سنتا ہے اور شاعر سے کہتا ہے کہ میری صحرانوردی پر اس کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ میری زندگی کا راز تو اسی صحرانوردی میں ہے۔ یہی اصل زندگی ہے۔ تھک کر بیٹھ جانا زندگی کی موت ہے۔ اس لئے میں تو ہمیشہ سفر ہی میں رہتا ہوں۔ یہی سفر میری زندگی ہے۔ گردشِ پیہم سے جامِ زندگی پختہ ہوتا ہے اور یہی درحقیقت زندگی کے دوام کا راز ہے۔ ان باتوں کے بعد خضر نے ان تمام سوالوں کے جواب دیئے ہیں جو شاعر نے اس سے دریافت کئے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ یہ خیالات درحقیقت زندگی کے بارے میں اقبال کے خیالات ہیں جن کو انہوں نے خضر کی زبانی پیش کیا ہے۔ خضر نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ زندگی سود و زیان کا نام نہیں۔ وہ اس سے بلند و برتر ہے۔ کبھی وہ جان ہو جاتی ہے اور کبھی تسلیمِ جان۔ یہ زندگی کسی ایک جگہ پر رکنا نہیں جانتی۔ اس کی جوانی کا راز تو اس کے پیہم اور

مسلسل رواں دواں رہنے میں ہے۔ زندگی کی حقیقت تو صرف کوہکن جانتا ہے کیونکہ وہ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ جب تک انسان کے دل میں کچھ کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی اور وہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے رواں دواں نہیں ہوتا، زندگی اپنے اصل روپ میں نمایاں نہیں ہوتی انسان اشرف المخلوقات ہے وہ زندگی کا راز ہے۔ ورنہ تو انسانی زندگی بے معنی ہے۔ اس انسان کے لئے آزادی ضروری ہے۔ اگر اس کو آزادی نصیب ہو تو زندگی پھیل کر بیکراں ہو جاتی ہے۔ انسان کا نصب العین زندگی کا عرفان ہے۔ اس کی تسخیر ہے اس پر قابو پانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کے لئے ایک امتحان بن جاتی ہے۔ وہ زندگی کو سنوارتا ہے۔ حالات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے زندگی کے سفر میں قدم قدم پر ان کو نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کے لئے یہ نبرد آزمائی ضروری ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی ہستی کو پہچانے۔ اپنی ذات میں خودی کی قندیل کو فروزاں کرے تاکہ اس میں فکر و عمل کی قوتیں بیدار ہوں۔ یہ قوتیں بیدار ہو جائیں تو وہ زندگی کی قوت پنہاں کو آشکار کرتا ہے اور یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرتی ہے جب تک یہ صورت حال وجود میں نہ آئے حالات بدل نہیں سکتے۔ آج زندگی اور خاص طور پر مشرق کی زندگی جن حالات سے دوچار ہے وہ تو عرصہ محشر کا منظر پیش کرتی ہے اس لئے عمل کی جس قدر ضرورت آج ہے شاید اس سے قبل کبھی بھی نہیں تھی۔ ان اشعار میں زندگی کے متعلق بعض بنیادی حقائق کا اظہار کتنی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

زندگی اور اس کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال کرنے کے بعد خضر سلطنت کے موضوع پر روشنی ڈالتا ہے وہ شاعر کو یہ بتاتا ہے کہ جس کو تم حکومت اور سلطنت سمجھتے ہو اور جو نظامِ اقدار اس میں رائج ہے وہ درحقیقت سرمایہ داری اور ہوس ملک گیری کے تماشے ہیں۔ ایک ملک دوسرے ملک کو غلام بنا لیتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر مسلط ہو جاتی ہے ملوکیت کا یہ سحر غلام قوم کی نفسیات کو بدل دیتا ہے۔ غلامی کے ساتھ مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے طوق غلامی کو اپنے لئے سازِ دلبری سمجھ لیتا ہے۔ مغرب نے مشرق پر غالب آکر یہی صورت حال پیدا کر دی ہے جس کو مغرب کا جمہوری نظام کہتے ہیں اور جس کا سبز باغ اکثر اقوام مشرق کو دکھایا جاتا ہے، وہ تو درحقیقت جبر و استبداد کی ایک شکل ہے یہ ظالموں کو کھلونے دے کر بہلاتا ہے۔ اس جمہوری نظام میں جو بحث مباحثے ہوتے ہیں وہ بھی درحقیقت سرمایہ داروں کی جنگ زرگری ہے۔ یہ گلستان نہیں، یہ تو سراب رنگ و بو ہے۔ یہ آشیانہ نہیں، یہ تو قفس ہے۔ اس لئے مغربی نظام اقدار ہی کو سب کچھ سمجھ لینا اس

کے لئے ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ اس سے انسانیت کا مداوا نہیں ہوتا بلکہ اس کے مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو جاتے ہیں۔ یہ اشعار موجودہ دور کی اجتماعی زندگی کے صحیح ترجمان اور سیاسی شعور کے صحیح عکاس ہیں اور موجودہ حالت کی صحیح تصویر پیش کر دیتے ہیں ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دلبری
خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری
سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

حقیقت سے بھرپور ان دانش مندانہ باتوں کے بعد خضر سرمایہ و محنت کے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور للکار کر کہتا ہے کہ بندہ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے تاکہ وہ اس

حقیقت سے آگاہ ہو جائے کہ سرمایہ دار حلیہ گر نے اس کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے مزدور ہی سب کچھ کرتا ہے۔ تہذیب کی عمارت اس کے لہو سے تعمیر ہوتی ہے لیکن سرمایہ دار اس کو اپنی ملکیت بنا لیتا ہے۔ اس کے عوض میں مزدور کو صرف وہ مزدوری ملتی ہے جس سے وہ بمشکل اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتا ہے اور وہ بھی سرمایہ دار اس کو کچھ اس طرح دیتا ہے جیسا اہل ثروت غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ غرض سرمایہ دار نے بڑے مکر و فریب سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے اس نظام حیات میں مزدور کی شکست ہو گئی ہے۔ مزدور ان چالوں کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ بنیادی طور پر وہ بہت سادہ و معصوم ہے۔ وہ سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ مزدور کو خواب سے بیدار ہونے کا پیغام دیتا ہے کیونکہ بدلتے ہوئے حالات میں اس کو ہر طرف مزدور کی خدائی نظر آتی ہے اور وہ مشرق و مغرب میں اس کے دور کا آغاز دیکھتا ہے۔ اس کے کان نغمۂ بیداری جمہور کو سنتے ہیں۔ ایک آفتاب تازہ اس کو زندگی کے افق پر ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کرمک ناداں کو طواف شمع سے آزاد کرنے کی خواہش اس کے دل میں بیدار ہوتی ہے اور وہ اس کو اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہونے کا پیام دیتا ہے۔

ان اشعار میں سرمایہ و محنت کی کش مکش، مزدور کی مجبوری اور معذوری، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بیداری کے جو خیالات پیش کئے گئے ہیں، وہ اقبال کی سماجی بصیرت اور ان کے ترقی پسندانہ رویے پر دلالت کرتے ہیں ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزدیں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
سکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

علامہ اقبالؒ کی سیاسی بصیرت ان اشعار میں ایک للکار پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ شاید دردمندی اور دلسوزی اس للکار کی بنیاد ہے اور اس کی تہہ میں انقلاب کے خیال اور ایک نئے نظام اقدار کے قیام کا احساس و شعور اس حد تک کارفرما نظر آتا ہے کہ اقبال اس کی روشنی میں آگے بڑھتا اور اس منزل تک پہنچتے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں شاہیت اور سرمایہ داری متزلزل نظر آتی ہے اور جہاں بطن گیتی سے ایک آفتاب تازہ پیدا ہونا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اقبال نے اس موضوع پر کیسے خوبصورت اشعار کی تخلیق کی ہے ؎

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تک

نغمہ بیداریٔ جمہور ہے سامان عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرت انسانی نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک
کرمک نادان طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار آباد ہو

ان خیالات کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام کی زبوں حالی بھی خضر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، اور وہ اس موضوع پر بھی اظہار خیال کرتا ہے۔ اس کے خیال میں مسلمانوں کی رسوائی اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ سیاست فرنگ نے اس کو شکار کر لیا ہے۔ اس کا لہو پانی کی طرح ارزاں ہے۔ ملت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے۔ مسلمانوں میں یک جہتی باقی نہیں رہی ہے اور یہ سب کچھ سیاست فرنگ کا کرشمہ ہے اور یہ خضر کے خیال میں انسانی تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ جب تک یہ صورت حال باقی ہے مشرق کی نجات ناممکن ہے۔ اتحاد اسلامی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ مسلمان جب تک حرم کی پاسبانی کے لیے ایک نہیں ہوتے ان کا آگے بڑھنا مشکل ہے اگر ان میں امتیاز رنگ و خون باقی رہا تو وہ مٹ جائیں گے۔ اسی لیے خضر خلافت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے اسلاف کے قلب و جگر کو ڈھونڈ کر لانے کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے خیال میں اسی طرح مسلمانوں کے دن پھر سکتے ہیں۔ اس صورت حال کی تفصیل اقبال نے کچھ اس طرح پیش کی ہے۔ اس وقت

کے عالم اسلام کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہتے ہیں۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستان
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز
لے رہا ہے مے فروشان فرنگستان سے پارس
وہ مے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلمان کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومیؒ ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

لیکن اقبالؒ یہیں پر جا کر رک نہیں جاتے بلکہ خضر کی زبانی ربط و ضبط ملت بیضا کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ یہ اشعار اس پیغام کے علمبردار ہونے کی وجہ سے کتنے جاندار اور جوش و خروش سے بھرپور ہیں ؎

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دین میں ہو
ملک و ملت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

لیکن خضر ان حالات سے دل برداشتہ اور مایوس نہیں ہے کیونکہ اس کی نگاہیں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تاریکیوں میں روشنی کی ایک کرن کو پھوٹتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ اس کو صاف نظر آتا ہے کہ یہ جہانِ پیر دم توڑ رہا ہے۔ ایک نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے اور ایک نئے دور کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ ان حالات میں مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے سینے میں آرزو کی شمع کو فروزاں رکھے کیونکہ نابتِ الہٰی اس کا منصب ہے۔

خضر کی یہ گفتگو درحقیقت اقبالؒ کی گفتگو ہے۔ اس گفتگو میں آنے والے دور کی تصویر صاف نظر آتی ہے اور اقبال اس نظم میں اسی تصویر کو ابھارنا چاہتے ہیں یہ نظم معنویت سے بھرپور ہے اس میں فکر کی گہرائی ہے، شعور کی پختگی ہے، جذب و شوق کی فراوانی ہے اور ان سب باتوں کو اقبالؒ نے شاعرانہ فن کاری کے ساتھ اس نظم میں کچھ اس طرح یکجا کیا ہے کہ یہ نظم بصیرت حرکت اور فکر و عمل کی ایک نہایت ہی حسین اور پہلودار تصویر بن گئی ہے۔

ساقی نامہ

ساقی نامہ علامہ اقبالؒ کی ایک لازوال نظم ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں فکرِ اقبال کے سارے خط و خال پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں۔ اقبال نے جو کچھ محسوس کیا ہے، جو خیالات انہوں نے قائم کئے ہیں، زندگی کی جو کیفیت انہیں نظر آئی ہے، حالات کا جو نقشہ ان کے سامنے آیا ہے اور ان کو دیکھ کر جو نتائج انہوں نے نکالے ہیں، ان سب کا ایک نہایت حسین اور دل آویز مرقع یہ نظم ہے۔ اس میں فکر ہے، فلسفہ ہے، تہذیبی اور سماجی شعور ہے، ایک بہت واضح نقطہ نظر ہے۔ ایک مکمل نظریۂ حیات ہے۔ اسکی بنیاد صرف خیال پر استوار نہیں ہے یہ شروع سے آخر تک حقیقت سے بھرپور ہے۔ یہ کش مکش حیات کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے۔ اس میں زندگی کو سنوارنے اور ماحول کو نکھارنے کا شدید احساس موجود ہے۔ انسانیت اور انسان دوستی کے خیال کی اس میں ایک لہر سی دوڑا دی ہے۔ یہ ایک بڑی ہی بھرپور اور ہمہ گیر نظم ہے۔ اس میں موضوع کا جلال بھی ہے اور فن کا جمال بھی۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایسے وسیع اور ہمہ گیر موضوع کو حد درجہ لطیف اور دلآویز انداز میں پیش کر دیا ہے۔ افادی اور جمالیاتی پہلوؤں کی ایسی مکمل ہم آہنگی مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ مل سکتی ہے۔ اس افادیت کو زندگی کے صحیح احساس، حالات کے صحیح شعور اور ان کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل کے خیال نے پیدا کیا ہے اور جمالیاتی پہلو کی تشکیل

صحیح اظہار اور صحت مند ابلاغ کے ہاتھوں ہوئی ہے اقبال نے بڑی ہی تیز و تند شراب کو شیشے میں بھرا ہے لیکن اس شیشے کا آئینہ تندی صہبا سے پگھلا نہیں۔

اس نظم کا آغاز بہار کی تصویر کشی سے ہوتا ہے لیکن یہ بہار صرف موسم ہی کا نام نہیں ہے بلکہ تبدیلی کی علامت اور نئی زندگی کا اشارہ ہے۔ اقبال زندگی کی اس کیفیت کو محسوس کرتے ہیں انہیں دنیا کا نقشہ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی نظریں چپے چپے پر کاروان بہار کو خیمہ زن دیکھتی ہیں اور اس کی وجہ سے دامن کوہسار پر انہیں ارم کا گمان ہوتا ہے۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کی نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ سارا جہان رنگ کے پردے میں چھپ گیا ہے۔ رگِ سنگ تک میں لہو کی گردش ہے فضا صاف شفاف اور نیلی ہے اور ہوا میں ایک خاص طرح کا سرور پیدا ہو گیا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ آشیانوں میں طیور تک نہیں ٹھہرتے جوئے کہستان تیزی سے رواں دواں ہے۔ اس نے پہاڑوں کے دل چیر دیئے ہیں اور یہ زندگی کا پیام سنا رہی ہے۔ یہ منظر شاعر کو متاثر کرتا ہے اور وہ یہ محسوس کر کے کہ موسم گل بار بار نہیں آتا ساقی لالہ فام سے مے پردہ سوز کے پلانے کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک ایسی مے جس سے ضمیر حیات روشن ہو جائے وہ مے جس سے مستی کائنات اور سوز و ساز ازل ہے اور جو رازِ ازل کو کھول دیتی ہے یہ راز کھل جائے تو حقیقت حیات کا انکشاف ہو سکتا ہے اور مومن کو شہباز سے لڑنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ اقبال اس بدلی ہوئی زندگی میں عرفان حیات کی تمنا کرتے ہیں اور کمزور کو زبردست سے لڑا دینے کی آرزو اُن کے دل میں انگڑائی سے لینے لگتی ہے۔

یہ خیال ان کی آنکھوں کے سامنے بدلتے ہوئے حالات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ انہیں زمانے کے انداز بدلے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی نگاہیں بدلے ہوئے ساز سے نئے راگ پھوٹتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ رازِ فرنگ فاش ہو چکا ہے پرانی سیاست گری خوار ہو چکی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین میر و سلطان سے بیزار ہے

سرمایہ داری دم توڑ چکی ہے اور جو تماشے ایک مداری کی طرح اس نے دکھائے تھے وہ اب نظر نہیں آتے۔ زندگی میں بیداری کی لہر ہے۔ ہندوستان جاگ رہا ہے۔ ہمالہ سے اس بیداری کے چشمے پھوٹ پڑے ہیں، دل طور سینا و فاران دو نیم ہو چکا ہے اور کلیم اب ایک بار پھر تجلی کا منتظر ہے لیکن اس پس منظر میں اقبال کو یہ دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے کہ اس انقلابی فضا میں بھی مسلمان بیدار نہیں ہوتا اس کے یہاں تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے: توحید میں اس کی گرمجوشی تو اپنی جگہ موجود ہے لیکن اس کا دل ابھی تک زنار پوش ہے، اس نے مسلمان ہونے کے باوجود بہت سے بت بنا لئے ہیں اور بت شکنی کی بجائے بت پرستی اس کا شیوہ ہے۔ اس کے تمدن میں، تصوف میں، شریعت اور کلام میں بتان عجم کی پرستش کا پہلو نمایاں ہے ہماری امت خرافات میں الجھی ہوئی ہے اور روایات میں اس نے اپنے آپ کو کھو دیا ہے اس کے خطیب لذت شوق سے بے نصیب ہیں۔ ان کا کلام دلوں کو ابھارتا ضرور ہے لیکن لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہے۔ اس کے صوفی جنہیں محبت میں یکتا اور حمیت میں فرد ہونا چاہیئے تھا عجم کے خیالات میں کھوئے ہوئے ہیں اور اسی لیئے یہ سالک مقامات سے آگے نہیں بڑھتے آتش عشق جو مسلمان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے بجھ چکی ہے اور وہ صرف آگ کا ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔

اقبال اس صورت حال پر کڑھتے ہیں لیکن ان پر مایوسی کا اندھیرا نہیں چھاتا وہ بیزار نہیں ہو جاتے، زندگی سے منہ موڑ لینے کا خیال انہیں نہیں آتا بلکہ ان حالات کو دیکھ کر ایک آرزو کی لہر سی ان کے دل میں اٹھتی ہے اور وہ ساقی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ انہیں شراب کہن کو پینے کی آرزو ہے تاکہ آگے بڑھنے کی سکت ان کے اندر پیدا ہو سکے۔ یہ شراب کہن درحقیقت اسلاف کے کارنامے ہیں، ماضی کی روایات ہیں، وہ لائحہ عمل ہے جس نے کبھی اجتماعی زندگی میں جولانی کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ اقبال اس کے سہارے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ان کو عشق کے پر لگ جائیں اور ان

کی خاک جگنو بن کر اڑ جائے۔ فرد غلامی سے آزاد ہو، جوان پیروں کے استاد بن جائیں ملت میں زندگی پیدا ہو۔ اس کو تڑپنے پھڑکنے کی توفیق عطا ہو اور اس کے افراد مرتضیٰ کے دل اور صدیق کے سوز کو لے کر زندگی کی راہ پر آگے بڑھیں۔ ان کے سینوں میں تمنا بیدار ہو جائے۔ جوانوں کے سینے سوز جگر سے معمور ہوں اور انہیں وہی عشق و تنظر مل جائے تاکہ وہ ناؤ جو بھنور میں پھنسی ہوئی ہے چل نکلے۔ اسرار مرگ و حیات ان پر روشن ہوں۔ دیدۂ تر کی بے خوابیاں اس کی پوشیدہ بے تابیاں، نالہ نیم شب کا نیاز، خلوت و انجمن کا گداز، ان کے یہاں بھی پیدا ہو جائے، امنگوں اور آرزوؤں کی شمعیں ان کے دلوں میں بھی فروزاں ہوں، ان کی فطرت بھی آئینہ روزگار اور غزالاں افکار کا مرغزار بن جائے۔ ان کا دل بھی رزمگاہ حیات کی صورت اختیار کرے جہاں گمانوں کے لشکر اور یقین کا ثبات موجود ہو تاکہ وہ بھی فقیری میں اپنے آپ کو امیر سمجھ سکیں کہ یہی متاع حیات ہے۔ اقبال کی تمنا یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ان کی امت کے قافلے میں لٹا دی جائیں تاکہ اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جو ان کے نزدیک صحیح معنوں میں زندگی ہے۔

یہاں پہنچ کر اقبال کو زندگی کا خیال آتا ہے اور وہ زندگی کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اس کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں چنانچہ وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ زندگی مسلسل ہے وہ ہر دم رواں ہے کائنات کی کوئی شئے بھی رم زندگی سے خالی نہیں۔ بدن کی نمود اسی سے ہوتی ہے اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے شعلے میں دھواں پوشیدہ ہوتا ہے۔ آب و گل کی صحبت اگرچہ اس پر گراں گزرتی ہے لیکن محنت آب و گل اس کو پسند ہے یہ ثابت بھی ہے سیار بھی اس کے مسلک مظاہر ہیں لیکن ان سب میں ایک وحدت نظر آتی ہے۔ یہ جہان جو بت خانہ شش جہات کہلاتا ہے، زندگی ہی کا تراشا ہوا ہے اس زندگی کو تکرار کی خو نہیں۔ ہر شخص اس میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے کائنات کی ہر چیز میں اس زندگی کی چمک دمک پائی جاتی ہے اور تاروں میں اسی کا نور ہے۔ چاندی، سونے اور پارے میں اسی کی

روشنی ہے جنگل بیابان اور چمن اور گلستان پھول اور کانٹے سب اسی زندگی کے مظاہر ہیں اسی کی طاقت سے کوہسار نظر آتے ہیں۔ جبریل و حور تک کو اس کے پھندے سے مفر نہیں۔ شاہین کے خون آلود پنجوں اور جال میں تڑپتے ہوئے کبوتر کی مجبوری میں بھی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور اس زندگی میں جو سکون و ثبات نظر آتا ہے وہ محض فریب نظر ہے۔ درحقیقت کائنات کا ہر ذرہ تڑپتا رہتا ہے۔ زندگی کا قافلہ ہر دم رواں دواں ہے۔ اسی لئے اس میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے زندگی راز نہیں ہے وہ صرف ذوق پرواز کا نام ہے بے شمار نشیب و فراز ان گنت بلندیاں اور پستیاں اس کے سامنے رہی ہیں لیکن اس نے ہمیشہ سفر کو بہت پسند کیا ہے اس کو ایک جگہ پر قیام کرنا نہیں آتا وہ تھک کر نہیں بیٹھتی منزل کے مفہوم سے وہ نا آشنا ہے سفر ہی اس کے لئے سب سے بڑی حقیقت ہے یہی زندگی کا نصب العین ہے وہ ایک جد و جہد کا نام ہے اسی لئے اس کو تڑپنے پھڑکنے میں راحت ملتی ہے۔ اس جہان میں زندگی مرتی نہیں بلکہ وہ موت کی گھات میں رہتی ہے۔ وہ لوگ نادان ہیں جو زندگی کو بے ثبات سمجھتے ہیں۔ اس کا نقش ترمٹ مٹ کے ابھرتا ہے۔ اس میں بلا کی جولانی ہے وہ بہت ہی زود رس ہے۔ وہ ازل سے ابد تک محض ایک دم نفس معلوم ہوتی ہے اور جس کو زمانہ کہا جاتا ہے وہ محض دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے۔

زندگی کی اس فلسفیانہ تحلیل کے بعد اقبال اس نظم میں خودی کی وضاحت کرتے ہیں کیونکہ خودی دراصل اس زندگی کا جوہر ہے۔ ان کے خیال میں خودی کی مثال ہی ایسی ہے جیسے تلوار میں دھار اگر زندگی تلوار ہے تو خودی اس میں دھار کی حیثیت رکھتی ہے اسی لئے وہ خودی کو راز درون حیات اور بیداری کائنات سمجھتے ہیں۔ وہ جلوہ بدمست اور خلوت پسند ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک سمندر ہے جو ایک بوند پانی میں بند ہو، وہ اندھیرے اور اجالے میں چمکتی رہتی ہے۔ وہ بے پایاں ہے، لامحدود ہے، تجسس اس کا نصب العین

ہے۔ اس کی طاقت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ سنگ گراں اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں بن جاتے ہیں۔ یہ سفر میں رہتی ہے، اس کو ٹھہرنا نہیں آتا۔ یہ رکنا نہیں جانتی، انسان کے ساتھ اس کی خودی کا تعلق ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ خاک آدم ہی میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ انسان کے دل میں اس کا نشیمن ہوتا ہے اور زندگی میں جو کارہائے نمایاں اس کے ہاتھوں ہوتے ہیں اس میں خودی ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ انسان کی تشکیل اس کے بغیر ممکن نہیں۔

لیکن خودی کے بھی اپنے کچھ تقاضے ہیں وہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک انسان اپنے اندر بعض صفات نہ پیدا کرے۔ جو شخص خودی کی تشکیل چاہتا ہے اور جو اس کو معراج کمال تک پہنچانے کا متمنی ہے اس کے لئے اپنے آپ کو پامال کر کے رزق حاصل کرنا اپنی ہستی کی آب و تاب کو کھو دینے کے برابر ہے۔ اگر یہ صورت حال ہو تو اس کی شخصیت میں خودی کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تو صرف ایسا رزق درکار ہے جس سے دنیا میں اس کا سر اونچا اور اس کی گردن بلند ہو سکے۔ اس لئے اقبال فرد کی پامالی کو خودی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں خودی نہ تو محمود کی شان و شوکت سے تعلق رکھتی ہے نہ ایاز کی حلقہ بگوشی سے۔ خودی کا علمبردار کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا کسی کے سامنے اس کا سر نہیں جھک سکتا۔ اس کے لئے اسی ذات کو سجدہ کرنا لازم ہے جو بے ہمتا ہے، جس کا کوئی ثانی نہیں۔ مادی زندگی خودی کے علمبردار کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ وہ صرف اسی کو اپنا مقصد نہیں سمجھتا۔ خودی کی یہ پہلی منزل ضرور ہے لیکن اس کو بنیادی نصب العین قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی کے سامنے اس کا سر نہیں جھک سکتا۔ اس کے لئے اسی ذات کو سجدہ کرنا لازم ہے جو بے ہمتا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ مادی زندگی خودی کے علمبردار کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ وہ صرف اسی کو اپنا مقصد نہیں سمجھتا۔ خودی کی یہ پہلی منزل ضرور ہے لیکن اس کو بنیادی نصب العین قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ منزل اولین ضرور ہے لیکن

نشیمن نہیں ہے۔ انسان دنیا کا حلقہ بگوش نہیں بلکہ دنیا انسان کی حلقہ بگوش ہے اسی لئے اس کو جہان کے زمان و مکان کو توڑ کر آگے بڑھنا چاہیئے کیونکہ اس کا کام تو کائنات کی تسخیر ہے اس پر قابو حاصل کرنا ہے اس کو اپنے سانچے میں ڈھالنا ہے زمین اور آسمان دونوں خودی کے اسیر ہیں کیونکہ وہ شیر مولا ہے جو شخص خودی کو لے کے آگے بڑھتا ہے اس کے سامنے صرف یہ جہان ہی نہیں ہوتا نہ جانے کتنے جہان اور ہوتے ہیں جن کو پیدا کرنے کا متمنی ہوتا ہے زندگی اس کی ملیغار کی منتظر رہتی ہے۔ گردش روزگار کا مقصد ہی یہی ہے کہ خودی انسان پر آشکار ہو انسان اس زندگی کا فاتح ہے یہی اس کی سرنوشت ہے۔ وہ زندگی کو پیدا کرتا ہے اس کو سنوارتا ہے نکھارتا ہے۔ یہ سب کچھ نہ ہو تو انسان کی ہستی کوئی معنی نہیں رکھتی خودی کی تکمیل ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔

یہ خیالات ہیں جن کو اقبال نے اس نظم کا موضوع بنایا ہے۔ یہ موضوع وسیع و ہمہ گیر ہی نہیں، رفیع و عظیم بھی ہے کیونکہ اس کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے بنیادی معاملات و مسائل سے ہے اور ان مسائل و معاملات کو اقبال نے مفکرانہ زاویہ نظر سے پیش کیا ہے اسی لئے نظم ایک مانوس فضا رکھتی ہے اور ساتھ ہی گہرے غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے اس کے ایک ایک شعر میں ایک فلسفیانہ آہنگ کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس فلسفیانہ آہنگ میں فن کارانہ زیر و بم کی شان پیدا کر دی ہے اور یہ اس نظم کی شاید سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس کا موضوع بظاہر نیا نہیں معلوم ہوتا لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں ایسی جدت نظر آتی ہے جس کی مثال ساری اردو شاعری میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ موضوع جدید اس لئے ہے کہ اس میں زندگی کے صحیح شعور کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے۔ اس کش مکش کا احساس بھی ہے جس سے زندگی دوچار ہوتی رہتی ہے اور اس کش مکش سے اس کو باہر نکالنے کا خیال بھی اس میں نمایاں ہے جو انسان پر فرض ہے اور

پھر زندگی کی ماہیت اور انسان کی حقیقت اور اس کی تکمیل کے تصورات بھی اس میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ اقبال نے ان تمام پہلوؤں پر ایک ماورائی اور مابعد الطبیعاتی انداز ہی میں فلسفیانہ بحث نہیں کی ہے بلکہ ایک باعمل مفکر کی طرح اس پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی یہ فکر بے مقصد نہیں ہے۔ ان کا فلسفہ بیکار نہیں ہے۔ اس کی تہہ میں تو نئی زندگی اور اس میں پیدا ہونے والے حالات کی حقیقت کو معلوم کرنے کا ایک خیال کارفرما ہے۔ اقبال نے اس نظم میں تغیر اور تبدیلی کے عمل کو صحیح طور پر محسوس کیا ہے۔ اسی لئے وہ زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور سرمایہ داری کے ختم ہونے کا خیال اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اقبال کی نظر ساری دنیا کی سیاست پر ہے اور جو کچھ سرمایہ داری کرتی رہی ہے جس طرح اس نے ایک مداری کی طرح تماشے دکھائے ہیں اس کا بھی انہیں علم ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک نیا نظام اقدار پیدا ہو رہا ہے، نئی قوتیں ابھر رہی ہیں جنہوں نے پرانی سیاست گری کو کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ ہر ملک میں بیداری کی لہر ہے۔ وہ اس تبدیلی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں لیکن جب ان کی نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ ان کی قوم کا حال دگرگوں ہے، وہ ابھی تک پرانی ڈگر پر گامزن ہے۔ اس کے افراد آج بھی یکسر فقیر ہیں تو انہیں غم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بنیادی طور پر مسلمان ہیں لیکن یہ خیال ان کے دل میں اس لئے بیدار ہوتا ہے کہ وہ اس انقلاب میں مسلمان کو پیش پیش دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ مسلمان کو وہ صحیح معنوں میں انسانی اقدار کا حامل سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں نئی زندگی اور نئی سیاست کو بیدار کرنے میں مسلمان کو پیش پیش ہونا چاہیئے۔ یہاں ان کی مسلمان دوستی انہیں محدود نہیں کرتی کیونکہ مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت کو وہ ایک عام انسانی ارتقاء اور ترقی میں پیچھے نہیں دیکھنا چاہتے۔ بلکہ اس کو اس راہ پر آگے بڑھانے کے خواہش مند ہیں اور ان کی یہ تمنا ہے کہ مسلمان مکمل ترین انسان بن کے دوسروں کو بھی صحیح ارتقا کی راہ دکھا سکے۔ اقبال نے اس نظم میں اعلیٰ ترین انسانی اقدار کی ترجمانی کی ہے۔ یہ اقدار مذہب، تہذیب

سماج اور اخلاق، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اسی لئے صحیح افادیت کی ایک لہر سی اس نظم کے موضوع میں دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا موضوع وسیع اور ہمہ گیر ہے اور اس میں قدم قدم پر ایک عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

ساقی نامہ انداز بیان، اسلوب اور طرز ادا کے اعتبار سے بھی ایک مکمل نظم ہے۔ بظاہر تو اس کا مجموعی رنگ و آہنگ روایت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے، اور ساقی نامے کی روایت اس میں پوری طرح موجود ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک نیا تجربہ بھی نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر اس نظم کی علاماتی فضا نظم کے ایک نئے مزاج کو ظاہر کرتی ہے۔ اقبال نے یہاں روایتی علامتوں اور اشاروں کو نئی معنویت میں استعمال کیا ہے اور نئی علامتوں اور نئے اشاروں کی تخلیق بھی کی ہے اسی لئے اس نظم میں ایک نئی اور جاندار امیجری کا پتہ چلتا ہے یہ امیجری روایت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے اور ساتھ ہی نئے افکار و خیالات کے ساتھ بھی اس کا گہرا رشتہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں ماضی اور حال گلے ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا آہنگ بہت ہی تیز و تند ہے جو افکار خیالات کی تیزی اور تندی کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اقبال نے اپنے مخصوص الفاظ کی دروبست سے اس آہنگ میں ایک تیکھاپن پیدا کر دیا ہے۔ اس کی لے نرم اور دھیمی نہیں لیکن یہ دلوں میں اثر کرتی ہے۔ کیونکہ حوصلے اور ولولے اس سے بیدار ہوتے ہیں۔ خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور کچھ کرنے کا خیال دل میں انگڑائیاں سی لیتا ہے۔ اقبال نے اسی مقصود کو سامنے رکھ کر یہ نظم لکھی ہے۔ اس میں پیش کئے ہوئے تمام خیالات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کا بنیاد محرک ہے اور اسی مقصدیت نے اس کو ایک لازوال نظم بنا دیا ہے۔

ذوق و شوق

اقبال ذوق و شوق کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں شروع سے آخر تک اس ذوق و شوق کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ اس میں حوصلے کی گرمی اور ولولے کی روشنی ہے اسی لیے اس میں زندگی کا احساس ہوتا ہے، جو لافانی نظر آتی ہے وہ نظریے اور نصب العین نقطہ نظر اور نظریہ حیات کی شاعری ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پیام کا پرچم ہے اور وہ اس پرچم کو کسی حال میں سرنگوں کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ وہ اس کو ہر حال میں بلند رکھنا چاہتی ہے۔ اس میں آرزوؤں کی شمعیں سی فروزاں ہیں۔ ولولوں کے چراغ سے روشن ہیں۔ اس کی عمارت خون جگر سے تعمیر ہوتی ہے اور اس خون جگر ہی نے اسے رنگین اور پرکار بنایا ہے۔ یہ سوز و سرور سے بھرپور ہے۔ اس میں شوق کی فراوانی ہے۔ اسی لیے اس کی لے میں تیزی اور اس کے آہنگ میں تندی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ابال کی سی کیفیت نہیں ہے۔ اس میں فکر کا عنصر غالب ہے اور اس فکر کے عنصر نے اسے بہت بلند اور باوقار بنا دیا ہے۔ اس میں بڑی ہی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے۔ وہ بڑی سنجیدہ شاعری ہے۔ لئے دیئے رہنا اس کے مزاج کی خصوصیت ہے لیکن وہ آداب جنون سے بھی ناآشنا نہیں ہے۔ جذب بے پایاں اور شوق فراواں نے اسے ایک لغزش مستانہ بھی بنا دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہوشیاری کا دامن نہیں چھوڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مستی میں

ہوشیاری اور ہوشیاری میں مستی کا احساس ہوتا ہے اور یہ دونوں پہلو اس میں ہر جگہ کچھ گلے ملتے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔

ذوق وشوق اقبال کی مشہور نظم ہے اور اس میں ان کی شاعری کی یہ خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس کا موضوع ذوق وشوق ہے اور اس ذوق وشوق کا خیال اس میں اپنے شباب میں نظر آتا ہے۔ ساری نظم یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے عالم جذب کی تخلیق ہے۔ اسی لئے اس کی معنویت کے تہہ در تہہ ہونے کا احساس ہوتا ہے اور اس کے ایک ایک نقطہ میں مفاہیم کی دنیا سی آباد نظر آتی ہے۔ اس میں زندگی اور کائنات کے ان گنت اسرار و رموز ہیں۔ انسان اور انسانیت کے بے شمار معاملات و مسائل ہیں۔ لیکن ان سب کو بڑے ہی بلیغ اشاروں اور کنایوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا پس منظر مسلمانوں کی ملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ درحقیقت ملی معاملات کے شدید احساسات ہی اس نظم کی تخلیق کے محرک ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی تان ایک آفاقی تصور حیات پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ اس تصور کا اطلاق ہر قوم اور ملک و ملت پر ہو سکتا ہے۔ اس کو مشعل راہ بنا کر ان میں سے ہر ایک زندگی کے راستے پر چھائی ہوئی اندھیاریوں میں آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس تصور کے آئینے ہی میں اسے منزل کی تصویر نظر آ سکتی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اس تصور کو فراق کے روایتی اشارے میں پیش کیا ہے اور گرمی آرزو اور شورش ہاؤ ہو کہہ کر اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس کے خیال میں یہ فراق موج کی جستجو اور قطرے کی آبرو ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص صحیح زندگی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا اور دولت تازہ کی دولت بیش بہا اسے نصیب نہیں ہو سکتی۔ اقبال اس کو عام کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہی ان کے نزدیک زندگی ہے۔ اسی کو وہ جوہر حیات سمجھتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو زندگی موت ہے اور زندگی اگر موت بن جائے تو زندگی نہیں رہتی۔

اقبال زندگی کو موت میں تبدیل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ زندگی انہیں بہت عزیز ہے اور وہ اس زندگی کے بہت بڑے پرستار ہیں۔

نظم کا آغاز صبح کی منظر کشی سے ہوتا ہے۔ شاعر کی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ صبح کا منظر دشت میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ منظر بہت ہی حسین ہے۔ اس میں بڑی ہی دلکشی اور شادابی ہے۔ اسی لیئے وہ اس منظر کو قلب و نظر کی زندگی سمجھتا ہے۔ کیونکہ آنکھ ہی اس سے لطف اندوز نہیں ہوتی، روح بھی متاثر ہوتی ہے اور روح کا یہ تاثر بہت ہی گہرا ہے۔ چنانچہ اس گہرے تاثر کا یہ نتیجہ ہے کہ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے شاعر کے یہاں حیات و کائنات کی بعض حقیقتیں بھی اجاگر ہوتی جاتی ہیں۔ جب وہ چشمہ آفتاب سے نور کی ندیوں کو رواں دیکھتا ہے تو اسے حسن ازل کی نمود نظر آتی ہے اور پردہ وجود اسے چاک نظر آتا ہے۔ ان مناظر میں ہر طرف جلوے ہی جلوے ہیں۔ یہ صبح کا منظر ہی نہیں ہے، یہ آفتاب اور اس کا نور ہی نہیں اس میں تو کوئی ادھ ہی ہستی اپنے آپ کو بے نقاب کرتی اور اپنے حسن کا جلوہ دکھاتی ہے۔ انسان اس جلوے کو دیکھنے کے لئے مجبور ہے کیونکہ اس پر ایک نگاہ صرف کرنے سے بے شمار روحانی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں اور یہ منظر دل کے لئے ہزار فائدوں کا باعث بنتا ہے چنانچہ وہ اس میں اپنے آپ کو پوری طرح گم کر دیتا ہے اور اس عالم میں اس کے کچھ اور گوشے اس کے قلب و نظر کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ سیاہ بادل سرخ اور نیلی بدلیوں کو چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں کوہ اضم نے رنگ برنگ کی قبائیں سی پہن رکھی ہیں۔ صبح کی ہوا صاف شفاف اور گرد سے پاک ہے اور برگ نخیل صاف اور دھلے دھلائے نظر آرہے ہیں۔ نواح کاظمہ کی ریت پرنیاں کی طرح نرم ہے غرض صبح کے منظر نے ہر چیز کو دل کش اور دلآویز بنا دیا ہے لیکن شاعر کی نگاہیں ان مناظر تک محدود ہو کر نہیں رہ جائیں یہ مناظر تو اُسے دور لے جاتے ہیں اور اس کی تخیل نہ جانے کہاں کہاں پہنچتی ہے۔ اس منظر میں وہ بجھی ہوئی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب کا منظر بھی دیکھتا ہے اور اس کے یہاں اس خیال کی لہر بھی اٹھتی ہے کہ نہ جانے کتنے قافلے اس مقام سے گزر چکے ہیں۔ صبح کے منظر کی رنگا رنگی اس کے تاریخی اور تہذیبی شعور میں تحریک پیدا کرتی ہے اور وہ تاریخ و تہذیب

کے جلوہ صد رنگ کو دیکھنے لگتا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی کیفیت اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے اور اس عالم میں وہ جبریل کی یہ صدا سنتا ہے کہ جذب صادق رکھنے والے اور ذوق و شوق کی شراب سے سرشار رہنے والوں کا یہی مقام ہے۔ یہی عاشق صادق کے لئے ابدی مسرت کا سرچشمہ ہے اور یہی اہل فراق کے لئے عیش دوام ہے کہ اس میں اسے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تصویر نظر آتی ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی شاعر اپنی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ اپنا اور اپنی قوم کا جائزہ لیتا ہے۔ اس جائزے سے اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اہل فراق میں سے نہیں ہے اور عیش دوام اس کا مقدر نہیں بن سکتا ہے کیونکہ صحیح زندگی اس سے جن باتوں کا تقاضا کرتی ہے وہ اس کے ہاتھوں پورے نہیں ہو سکے ہیں اور اس صورت حال نے مئے حیات کو اس کے لئے زہر بنا دیا ہے۔ اس کے آس پاس اور گرد و پیش جو کائنات ہے وہ کہنہ ہے لیکن اس کے واردات تازہ ہیں۔ وہ نئے انداز میں سوچتا ہے۔ اس لئے اسے اپنے آس پاس اور گرد و پیش کی بے حسی کو دیکھ کر ایک الجھن سی ہوتی ہے۔ وہ ناسازگار حالات پر کڑھتا ہے اور اس کے دل میں ان خیالات کی لہریں اٹھتی ہیں کہ یہ بے حسی کا عالم کیوں پیدا ہوا ہے؟ عمل کے ولولے کیوں سرد ہو چکے ہیں؟ جہاد کی طرف افراد کی توجہ کیوں نہیں ہے؟ کارگہ حیات میں کوئی عزیزی کیوں باقی نہیں رہا ہے؟ حالانکہ اہل نظر کے سومنات نہ جانے کب سے منتظر بیٹھے ہیں۔ اسے یہ دیکھ کر روحانی تکلیف ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہے۔ اب ان میں عربی مشاہدات اور عجمی تخیلات دونوں باقی نہیں رہے ہیں۔ قافلہ حجاز میں آج ایک بھی حسین رضؓ نہیں ہے حالانکہ گیسوئے دجلہ و فرات آج بھی تاب دار ہے۔ اس کا سبب شاعر کے خیال میں یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے سینے عشق کے نور سے خالی ہیں۔ ان میں وہ اگلا سا جذب و شوق باقی نہیں رہا ہے۔ عشق نہ ہو تو عقل و دل و نگاہ سب بے نور ہو جاتے ہیں اور شرع و دین بت کدہ تصورات کی صورت اختیار کر لیتا

ہے۔ عشق عمل اور جذب و شوق کی ایک لغزش مستانہ ہے۔ اس کے بغیر ہر بات خیال اور تصوراتی ہو جاتی ہے۔ اس لئے زندگی میں عشق لازمی اور ضروری ہے اور اس عشق کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی عشق کہیں صدق خلیلؑ اور صبر حسینؓ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کہیں معرکۂ وجود میں اس کی صورت بدر و حنین کی ہو جاتی ہے۔ غرض مسلمانوں کی تاریخ میں عشق مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے لیکن شاعر یہ دیکھ کر کڑھتا ہے کہ اب مسلمان اس جذبہ عشق سے محروم ہو گئے ہیں اور ان میں جذب و شوق کا یہ ولولہ باقی نہیں رہا ہے جو مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بناتا ہے۔

یہ منزل شاعر کے خیال میں زندگی کے سفر کی بڑی ہی کٹھن منزل ہے اور اس کا واحد علاج اس کے نزدیک عشق رسولؐ ہے۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرض حال کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ وہ آیہ کائنات کے معنی دیرباب ہیں۔ ان کی تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو نکلے، دنیا کے لوگ ان کے عشق سے سرشار ہیں، انہوں نے اس کی تلاش و جستجو کی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آج کے جلوتیاں مدرسہ نے اپنے ذوق کو مردہ کر لیا اور اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ صوفیوں میں جذب و شوق باقی نہ رہا۔ ان کے کاسے اس نعمت بیش بہا سے خالی رہے۔ شاعر کو اس کا بڑا غم ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ اس کی شاعری میں آتش رفتہ کا کچھ سراغ موجود ہے اس میں جذب و شوق کی فراوانی ہے۔ اس کا نصب العین کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اس نے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو کیا ہے۔ اس کی نوا کی پرورش خون دل و جگر سے ہوئی ہے اور اس کی رگ ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں ہے۔ یعنی اس نے سب کچھ عشق رسولؐ ہی سے حاصل کیا ہے اور اس کی شاعری میں جو جذب و مستی ہے اس کا محرک بھی عشق رسولؐ ہے۔ اس لئے وہ اس عشق میں اضافہ چاہتا ہے تاکہ وہ زندگی میں جذب و شوق کی ایک لہر دوڑا سکے اور یہ سب کچھ ممکن ہے کیونکہ جس عظیم ہستی سے وہ فیض حاصل کرنا چاہتا ہے، اس سے قربت ان تمام

خیالات کو عمل میں تبدیل کر سکتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کیونکہ اس عظیم و برگزیدہ ہستی نے ذرہ ریگ کو طلوع آفتاب بنا دیا ہے اور بعض شخصیتیں اس کے فیض سے عظیم اور باوقار بنی ہیں۔ شوکت سنجرؒ و سلیمؒ میں اس کا جلال اور فقر جنید و بایزید میں اس کا جمال بے نقاب نظر آتا ہے۔ اس لئے اس کا عشق ہی انسان کے لئے سب کچھ ہے، یہ عشق نہ ہو تو نماز بے کار اور قیام و سجود دونوں بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی نگاہ سے عشق و عقل دونوں کی مراد بر آتی ہے۔ اقبال اس عشق رسولؐ کو عام دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں زندگی پر جو تاریکیاں مسلط ہیں وہ صرف اس نور ہی سے چھٹ سکتی ہیں۔ اسی لئے وہ اس جلوۂ بے حجاب سے طبع زمانہ کو تازہ کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔

اس نظم کے آخری بند میں اقبال نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب تک میں علم ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا اور میرا خیال یہ تھا کہ اس علم ہی سے زندگی کے مسائل حل ہو سکتے ہیں، لیکن زندگی کے تجربے نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ آج مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ علم نخیل بے رطب ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عقل اس زندگی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہاں اقبال نے عقل اور علم کو مادیت اور مادہ پرستی کے مترادف قرار دیا ہے۔ اس مادیت اور مادہ پرستی کو وہ انسانیت اور تہذیب کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے عقل کو بولہب اور عشق کو مصطفیٰ کہا ہے۔ اس عشق کی ابتداء اور انتہا دونوں عجیب ہوتی ہیں۔ عشق کی کامیابی وصل میں نہیں ہے۔ وصل تو عشق کی موت ہے کیونکہ اگر وصل حاصل ہو جائے تو آرزو مر جاتی ہے اور آرزو اقبال کے خیال میں زندگی کی علامت ہے۔ عشق کی معراج تو ہجر و فراق ہے۔ کیونکہ اس عالم میں لذتِ طلب باقی رہتی ہے۔ وصل حوصلہ نظر کا دشمن ہے۔ اصل زندگی تو فراق ہے اور اسی فراق کو عشق کی معراج سمجھنا چاہیئے۔ فراق ہی سے گرمی آرزو اور شورش ہا دہو ہے۔ فراق ہی موج کی جستجو اور قطرے کی آبرو ہے۔ غرض فراق ہی زندگی کی علامت ہے۔ اس عالم فراق ہی میں ذوق و شوق پرورش

پاتے ہیں۔ ان ہی کے سہارے انسان زندہ رہتا ہے اور اس میں وہ تڑپ باقی رہتی ہے جو زندگی کی دلیل ہے۔ اقبال کو یہ زندگی بہت عزیز ہے وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اسی لئے ذوق و شوق کو معیار بنا کر وہ ہجر و فراق کی آرزو کرتے ہیں تاکہ زندگی کا یہ تسلسل قائم رہے۔

جیسا کہ خود اقبالؒ نے لکھا ہے اس نظم کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے ہیں۔ مسلمانوں کو فلسطین کے ساتھ جو نسبت خاص ہے اس کے پیش نظر وہاں پہنچ کر ہر سچے اور پُر خلوص مسلمان کے یہاں اسی قسم کے خیالات کا پیدا ہونا یقینی ہے جن کو اقبال نے اس نظم کا موضوع بنایا ہے۔ یہاں اقبال کے سامنے کے تمام پردے اٹھ گئے ہیں۔ تاریخ نے ان کے سامنے اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ حال کی پوری تصویر ان کے سامنے آگئی ہے اور اسی پس منظر میں انہوں نے مسلمانوں کے موجودہ معاملات کو پیش کیا ہے اور ان کے مسائل کی پوری طرح ترجمانی کی ہے۔ لیکن یہ نظم ان معاملات و مسائل کی ترجمانی اور عکاسی ہی تک محدود نہیں ہے۔ اس میں ان کے لئے ایک بہت واضح اور مکمل پیام بھی موجود ہے۔ اس سے انہیں ایک ولولہ تازہ بھی ملتا ہے۔ یہ انہیں جذبۂ شوق سے سرشار بھی کرتی ہے۔ عشق رسولؐ اس نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ اقبال کے خیال میں یہی عشق انسان کو مرد مومن بناتا ہے۔ اسی سے اس میں وہ ذوق یقین پیدا ہوتا ہے جس سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ اسی کی بدولت اسے یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم سے قربت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ذوق و شوق کی ان شمعوں کو فروزاں رکھنا ان کے نزدیک وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر زندگی کا قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس کے منزل سے ہم کنار ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ منزل اقبال کے خیال میں زندگی

کا وہ مثالی تصوّر ہے جسے وہ عزیز رکھتے ہیں اور جس کو عمل کے سانچے میں ڈھالنا ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ اقبال نے ذوق و شوق کے اشاروں میں زندگی کے اسی مثالی تصوّر کی عملی شکل کو اس نظم کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے جذب و شوق نے اسے ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز بنا دیا ہے۔

اقبال کی نثر نگاری

اسلوب کے بارے میں جتنی باتیں بھی آج تک کہی گئی ہیں ان میں یہ خیال مشترک ہے کہ وہ ایک ایسا طرز اظہار ہے جس کو انسان اور انسانی شخصیت کا آئینہ کہنا چاہیئے بوفان BUFFON نے یہ جو کہا ہے کہ اسلوب خود انسان ہے اور اسٹنڈال نے جو یہ بات واضح کی ہے کہ اسلوب ان تمام حالات و واقعات سے تشکیل پاتا ہے جس میں سے ہو کر کسی لکھنے والے کو گزرنا پڑتا ہے اور جو اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں وہ بالکل صحیح ہے۔ ہر لکھنے والا اپنے اسلوب میں اپنی پوری شخصیت کو پیش کر دیتا ہے اگر وہ شخصیت کو پس پردہ رکھنا بھی چاہے اور نفی شخصیت کے نظریے کا قائل ہو تب بھی اس کے اسلوب میں کسی نہ کسی زاویے سے اس کی پوری شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ شعوری طور پر چاہے بھی تو اس صورت حال سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔

یہ اسلوب دو بنیادی چیزوں کا مرکب ہوتا ہے۔ ایک تو خیال یا تجربہ، جس میں لکھنے والے کی پوری شخصیت ظاہر ہوتی ہے، دوسرے اس تجربے کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ کا استعمال ہے۔ اسی لئے تو یہ کہا گیا ہے اور اس بنیادی خیال سے سب ہی متفق ہیں کہ اسلوب درحقیقت شخصیت ہے جو الفاظ کا لباس پہن کر جلوہ نما ہوتی ہے اور وہ

کردار اور اس کی خصوصیت ہے جس کا اظہار گفتگو اور بات چیت میں سمو دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب میں لکھنے والے کی شخصیت اور اس کی تمام خصوصیات یک جا ہو کر سامنے آجاتی ہیں اس اسلوب سے پڑھنے والا نہ صرف لکھنے والے کو پہچانتا ہے بلکہ اس کے شعور اور تحت شعور میں جو بے شمار لہریں اُٹھ رہی ہیں ان سے آشنا ہو جاتا ہے۔

اور یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لکھنے والا اپنے اسلوب کے ذریعے سے اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ خیالات و نظریات درحقیقت لکھنے والے کے جذباتی اور ذہنی تجربات کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ان تجربات کو مناسب اور متناسب الفاظ کے استعمال کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کرتا ہے کہ اس میں اظہار و ابلاغ کے ساتھ حسن و جمال کی اقدار نمایاں ہونے لگتی ہیں۔

جب اسلوب کی تخلیق کا عمل اس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تب اس میں وہ صورت پیدا ہوتی ہے جس کو بعض نقادوں نے CHARYSTALLISTION کے عمل کا نام دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ CHARYSTALLISATION کا یہ عمل نہایت پیچیدہ ہے۔ اس میں موضوع کی نوعیت، خیال کی کیفیت، جذبے اور شعور کی حالت مل کر الفاظ اور زبان کے استعمال کی محرک ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک مخصوص آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ ایک مخصوص نغمگی اور موسیقیت وجود میں آتی ہے۔ مخصوص علامتیں تشکیل پاتی ہیں۔ اور مخصوص تصویریں اُبھر کر سامنے آتی ہیں اور یہ سب مل کر حواس اور دل و دماغ پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ انسان ان کی ساحری سے مسحور ہو جاتا ہے۔

اور یہی اسلوب کا اصل مقصد اور صحیح دائرہ کار ہے۔

(۲)

علامہ اقبال نے بھی، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب نثر میں بھی یہی خصوصیات پیدا کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نثری اسلوب بھی اپنی ایک مخصوص، انفرادیت رکھتا ہے۔ وہ ان کی شخصیت کا آئینہ ہے ان کے کردار کی صحیح تصویر ہے۔ وہ ان کے خیالات و نظریات کا عکس ہے۔ ان کے ذہنی رجحانات کا سایہ ہے۔ وہ ان کی شخصیت ہی کی طرح جاندار اور پختہ ہے۔ اس میں وہی رنگ و آہنگ نظر آتا ہے جو ان کے ذہنی اور جذباتی تجربات میں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں جو لہریں شعور اور تحت شعور میں اٹھتی رہی ہیں۔ اس کی پرچھائیاں ان کے اسلوب میں بھی پڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کا ہیولا بے شمار رنگوں سے تیار ہوا ہے اور یہ رنگ علامہ اقبال کی پہلو دار متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کے رنگ ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ علامہ کا اسلوب ان بے شمار رنگوں کی ایک قوس قزح کے روپ میں اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔

اس اسلوب نثر کا منبع علامہ کے تجربات ہیں۔ اس کی بنیاد ان کے وہ خیالات و نظریات اور عقائد و تصورات ہیں جو ان کی شخصیت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں اور جنہوں نے علامہ اقبال کو ایک مفکر بھی بنایا ہے اور ایک فن کار بھی۔ یوں علامہ اقبال نے اپنے فلسفے میں جذبے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اسی لئے عقل کے مقابلے میں عشق ان کے ہاں غالب نظر آتا ہے۔ لیکن ایک مقام ان کے ہاں ایسا بھی آیا ہے جہاں وہ عقل کو جذبے پر ترجیح دیتے ہیں اور وہ فنونِ لطیفہ کی تخلیق ہے۔ ضربِ کلیم میں انہوں نے فنون لطیفہ کے متعلق ایک قطعہ درج کیا ہے جس میں عشق کو عقل خداداد کی پیروی کرنے کی تلقین کی ہے تاکہ کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کر سکے اور کہن روح کو تقلید سے آزاد کرنے کا موقع فراہم ہو۔

عشق اب پیروئ عقل خداداد کرے
آبرو کوچہ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

یہ قطعہ معنویت سے بھرپور ہے اور فنونِ لطیفہ کے متعلق علامہ اقبالؒ کے بنیادی نظریے کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ اسلوب فنون لطیفہ کی روح ہے اور اس کی تشکیل میں عقل اور ذہن وشعور کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے سہارے اس کے اظہار و ابلاغ میں شعور کی حکمرانی کے لئے سازگار ماحول پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلوب کی تشکیل فن کار کے ہاں صرف اضطراری طور پر نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے پیکر کو تراشنے میں اپنے شعور سے بھی کام لیتا ہے۔ گویا ایک تنقیدی زاویہ نظر کے ہاتھوں اس اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر میں یہ صورت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے جذباتی انداز کی نثر نہیں لکھی ہے۔ برخلاف اس کے عملی طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ نثر ایک ایسا فن ہے جس میں صرف جذباتی انداز سے کام نہیں چلتا۔ اس کو تو عقل وشعور کا دامن پکڑ کر آگے بڑھنا پاتا ہے۔ یہی بات اس کو اپنے فنی حدود میں رکھتی ہے اور اس فن کی بلندیوں پر پہنچاتی ہے کیونکہ اس طرح اس میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت نمایاں ہوتی ہے اور ایک لغزش مستانہ اور جرأت اندانہ کے ساتھ ایک طرز حکمانہ کی سنجیدگی اپنی جھلکیاں دکھانے لگتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر میں ایک والہانہ انداز کے ساتھ ایک مفکرانہ رکھ رکھاؤ اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفکر، ایک فلسفی، ایک سیاسی رہنما، ایک ماہر تعلیم، ایک دینی عالم، ایک ادبی محقق اور نقاد تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ عہد قدیم سے لے کر موجودہ دور تک کے تقریباً تمام فلسفی ان کے

مطالعے میں رہے تھے۔ ساتھ ہی نفسیات، سائنس اور سماجی علوم کے ماہرین کی تحریریں بھی ان کے سامنے رہی تھیں۔

مذہبی اور دینی علوم کے علم برداروں کو بھی انہوں نے بغور پڑھا تھا اور ادب و شعر سے دلچسپی لینے والے محققوں اور نقادوں کی تحریریں بھی ان کے پیش نظر رہی تھیں۔ ان میں سے کسی کا کم اور کسی کا نسبتاً زیادہ اثر علامہ اقبالؒ کے ہاں موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے خیالات یا تحریر کے انداز سے انہوں نے کوئی ایسا اثر قبول نہیں کیا ہے جو کسی خاص رجحان کی صورت میں ان کے ہاں نمایاں ہو۔ البتہ ان سب کی تحریروں کے مفکرانہ انداز، فلسفیانہ تحلیل منطقی اظہار کے اثرات مجموعی طور پر ان کے ہاں ضرور ملتے ہیں اور وہ جو ایک گہرائی اور پختگی باقاعدگی اور استواری ان کے اسلوب نثر میں نمایاں ہے وہ انہیں مفکروں فلسفیوں، مورخوں، سائنسدانوں، ادیبوں اور نقادوں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جس وقت لکھنا شروع کیا ہے، اس وقت سرسید احمد خان کی تحریک کے اثرات اردو نثر کی روایت پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ سرسید احمد خان نے انیسویں صدی کے آخر میں اردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کیا تھا اور مختلف علوم کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے ایک ایسے اسلوب نثر کی داغ بیل ڈالی تھی جو کسی حد تک خشک اور سنگلاخ ضرور تھا لیکن عام فہم ہونے کی خصوصیت اس میں بہر صورت موجود تھی۔ وہ مقصدی تھا۔ اس میں افادیت کے خیال کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی تھی۔ سرسید اور ان کے رفقاء حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی سب کے سب اس اسلوب کے علم بردار تھے۔ محمد حسین آزاد کا اسلوب اس اسلوب سے مختلف تھا اس میں زیادہ رنگینی اور پرکاری تھی لیکن افادیت کا خیال اس میں بھی موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سرسید اور ان کے رفقاء کے اسلوب کی سی سنجیدگی اور باقاعدگی نہیں تھی شاید اس کا سبب یہ تھا کہ آزاد سرسید سے زیادہ قریب نہیں تھے۔ ادب اور شاعری کے چسکے نے ان

کے اسلوب میں وہ رعنائی پیدا کردی تھی جو سرسید کے اسلوب میں نہیں تھی۔ بہرحال علامہ اقبال اس ماحول سے ضرور متاثر ہوئے جو سرسید کے زیر اثر اردو نثر میں پیدا ہوا تھا۔ اسی لئے علمی موضوعات کو سنجیدہ اسلوب نثر میں پیش کرنے کا تجربہ ان کے ہاں کامیاب رہا اور انہوں نے اس تجربے کو اردو کی سنجیدہ نثر کی روایت کا جز بنا دیا۔

سرسید کی تحریک سے ملی جلی مخزن کی تحریک تھی جس کے سب سے بڑے علمبردار سر شیخ عبدالقادر تھے جنہوں نے اردو میں ایک نئے اسلوب نثر کی بنیاد رکھی اور ایسے لکھنے والوں کو اپنے آس پاس جمع کیا، جنہوں نے سرسید کے اسلوب نثر میں تھوڑا سا رومانی رنگ بھر کر ایک نئے اسلوب کو پیدا کرنے کا تجربہ کیا۔ علامہ اقبال مخزن کی اس تحریک کے ساتھ پوری طرح وابستہ رہے۔ اس لئے اس تحریک کے زیر اثر اسلوب نثر کے جو رجحانات پیدا ہوئے اس کا علامہ نے بھی اثر قبول کیا۔ چنانچہ ان کی بہت سی نثری تحریروں میں اس اسلوب نثر کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔

یہ اثرات علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر میں موجود ہیں لیکن انہوں نے ان سب کے امتزاج سے اپنی انفرادیت کی تشکیل کی ہے۔ اسی لئے اپنے عہد کے ان اسالیب نثر سے متاثر ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا ایک ایسا اسلوب بنایا ہے جس میں ان کی انفرادیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔

(۳)

سب سے پہلے تو ان کی یہ انفرادیت اس اسلوب میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے جو انہوں نے معاشی اور اقتصادی موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ ایسے علمی موضوع کو اردو میں پیش کرنے کی روایت اس سے قبل موجود نہیں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس سے قبل فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج میں علمی موضوعات کو اردو نثر میں پیش کرنے کے تجربے ہوئے تھے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے بھی اس کی طرف توجہ کی تھی لیکن کوئی باقاعدہ ضخیم تالیف اس موضوع پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے سب سے پہلے اقتصادیات پر ایک باقاعدہ تالیف پیش کی اور اس میں ایک ایسا اسلوب نثر اختیار کیا جو اس موضوع کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

اس اسلوب نثر کے متعلق علامہ اقبال دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہو گا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر باذاق آدمی جانتا ہے میں نے بعض اصلاحات خود وضع کی ہیں، اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانہ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورے کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سرمایہ، سرمایہ داروں کے معنوں میں یا محنت، محنتوں کے معنوں میں اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس

معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو بامذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستقل ہیں۔ اگر اس لطیف محاورہ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔" [1]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ جس وقت اس موضوع پر قلم اٹھا رہے تھے اس وقت بھی ان کے پاس زبان کے استعمال اور طرزِ عبارت کی تشکیل کا شعور موجود تھا یہ محض ان کی عاجزی اور انکساری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہلِ زبان نہیں سمجھتے حالانکہ زبان پر جس قدرت کا اظہار عملی طور پر انہوں نے کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اہلِ زبان ہیں بلکہ اس زبان میں مشکل سے مشکل علمی موضوعات کو ظاہر کرنے پر قدرت رکھتے ہیں سالیسانہ ہوتا تو وہ اردو زبان میں اس متین طرزِ عبارت کو تخلیق کرنے کا تجربہ نہ کر پاتے جو انہوں نے مغرب میں علمی موضوعات پر لکھی جانے والی نثر کے زیرِ اثر کیا ہے۔ علمی اصلاحات کی اہمیت کا بھی انہیں اندازہ نہ ہوتا۔ فارسی محاورات کا ترجمہ کرنا بھی ان کے بس کی بات نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ جو علامہ اقبال نے کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اردو زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور انہوں نے انگریزی، عربی، فارسی کے مختلف اسالیب کو سامنے رکھ کر اردو میں علمی نثر رکھنے کی ایک نئی طرح ڈالی ہے اور اس طرح ایک نئے اسلوب نثر کا تجربہ کیا ہے جو اردو کی نثری روایت میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

لیکن اقتصادیات کے ایسے موضوع پر لکھتے ہوئے انہوں نے صرف متین طرزِ عبارت، علمی اصلاحات اور محاوروں کے تراجم ہی کا خیال نہیں رکھا ہے۔ مجموعی طور پر ایک ایسے اسلوب نثر کی تشکیل بھی کی ہے جو نہ صرف علمی مسائل اور ان کے اسرار و رموز کے اظہار و ابلاغ کی

---

[1] علم الاقتصاد، ص ۲۵۔

صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اس کی پختگی اور روانی، اور ایک خاص طرح کی مصورانہ تصویر کشی کے ساتھ مل کر اس میں ایک طرح کی جمالیاتی شان بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

مثلاً یہ عبارت دیکھیے:۔

"علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کا تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج، اس کے اوضاع و اطوار اور اس کے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے بلکہ اس کے دماغ قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّٰی آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسان کے قیام کے لیے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لیے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے

اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مفلسی بھی نفس عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"[1]

اس عبارت میں پختگی اور روانی، صفائی اور سادگی، وضاحت اور صراحت کی وہ خصوصیات ہیں جو علمی تحریروں کو زندہ اور جان دار بناتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر میں ان خصوصیات کو مغرب کی فلسفیانہ اور فکری تحریروں کے وسیع اور گہرے مطالعے نے پیدا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس عبارت میں روزمرہ اور محاورے کا صحیح اور برمحل استعمال بھی ملتا ہے۔ زبان پر قدرت بھی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے مفہوم پوری طرح واضح ہوتا ہے اور موضوع کا ابلاغ بھی پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ابلاغ میں کچھ ایسی تصویریں بھی ابھرتی ہیں جو مطالعہ کے اسلوب کو زندگی سے معمور کر دیتی ہے۔ مثلاً تاریخ انسان کے ساتھ میل رواں، زندگی کے دھندے کے ساتھ ظاہری اور باطنی قویٰ کو چپکے چپکے اپنے سانچے میں ڈھالنے اور گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں اور مفلسی کو صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی تصویریں اقبال کے اسلوب نثر کو ایک خاص قسم کی گہرائی سے آشنا کرتی ہیں۔ ان سے علمی مفہوم بھی واضح ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے حواس ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں الفاظ کا صوتی آہنگ اس تاثر میں سر نے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور اس طرح اس میں زیادہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ علامہ اقبالؒ نے علم الاقتصاد لکھ کر اردو میں علمی نثر لکھنے کا ایک نیا تجربہ

---

[1] علم الاقتصاد (دیباچہ مصنف) صفحہ ۲۳۔

کیا اور ایک ایسے اسلوب نثر کی داغ بیل ڈالی جو ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور جس نے ان کو، جہاں تک علمی نثر لکھنے کا تعلق ہے۔ ایک منفرد اور صاحب طرز انشاد پرداز بنا دیا ہے۔

(۴)

اس میں شبہ نہیں کہ اقتصادیات کے موضوع پر علامہ اقبالؒ کی یہ تالیف علم الاقتصاد ان کے عالمانہ اسلوب نثر کا بہت ہی اچھا نمونہ ہے۔ اردو میں نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال ملتی ہے نہ اس کے بعد۔ یہ ایک علمی اور ٹیکنیکل موضوع تھا۔ اس لئے اس کو پیش کرنے کے لئے ایک ایسا پختہ شگفتہ اور رواں اسلوب نثر جس سے علامہ اقبال نے کام لیا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کام کو صرف اقبال ہی انجام دے سکتے تھے کیونکہ ان کی شخصیت میں بعض ایسے پہلو نمایاں تھے جن کے بغیر اس قسم کے اسلوب نثر کی تشکیل و تعمیر ناممکن سی بات ہے۔

علامہ اقبال نے نثر لکھنے کا آغاز تو اس کتاب علم الاقتصاد سے کیا لیکن اس کے بعد وہ مختلف موضوعات پر علمی نوعیت کے مضامین لکھتے رہے۔ ان مضامین میں وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ اسلوب نثر کچھ زیادہ ہی نکھرتا گیا اور اس میں پختگی اور استواری کچھ زیادہ ہی پیدا ہوتی گئی۔ ان کے وہ مضامین و مقالات جو انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف علمی موضوعات پر لکھے، ان میں یہ اسلوب نثر اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

اس اعتبار سے ان کا مضمون "بچوں کی تعلیم و تربیت" بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس مضمون میں علامہ اقبالؒ نے بچوں کی نفسیات، اور ان کی زندگی کے عام مسائل خصوصاً تعلیم و تربیت کے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بچوں کی تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

"سچ پوچھئے تو قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے اگر طریق تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصے میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے شاخوال بن جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لئے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے، اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو، جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کے ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیں۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہونا چاہیئے تاکہ اس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینے سے تعصبات اور توہمات کے زنگ کو دور کر کے اسے مجلا اور مصفا کر دیتی ہے۔" [1]

یہ خاص مجلا اور مصفا نثر ہے۔ یہ مرصع نثر تو نہیں ہے لیکن اس میں سادہ پرکاری کی جھلکیاں ضرور نمایاں ہیں۔ بچوں کی تعلیم کو قومی عروج کی جڑ کہنا، شکایات کے دور ہونے کے لئے کافور ہونے کا پیکر تراشنا، انسان کے ہر فعل کو روشنی سے تعبیر کرنا اور اس کی کرنوں کا اثر دیانت اور صلح کاری کی صورت میں دیکھنا، اور روح کے آئینے کا توہمات کے زنگ سے پاک ہو کر مجلا اور مصفا حالت میں نظر آنا، اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ یہاں علامہ اقبالؒ نے اپنے اسلوب نثر میں محدود طریقے ہی سے سہی، لیکن تخیل سے کام ضرور لیا ہے اس لئے جو تشبیہات و استعارات انہوں نے استعمال کئے ہیں اور جو تصویریں انہوں نے تراشی ہیں، ان سب نے مل کر ان کے اسلوب نثر میں ایک سادہ پرکاری کی خصوصیت پیدا

---

[1] مقالات اقبال (بچوں کی تعلیم و تربیت) صفحہ ۲۔

کر دی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے اس سنجیدہ لیکن سادہ پُر کار اسلوب میں ایک پہلو وہ بھی ہے جو ان کے اسلوب نثر کو زیادہ شگفتہ اور شاداب بنا دیتا ہے۔ اپنی بات پڑھنے والوں کے ذہن نشین کرانے کے لئے وہ فلسفہ، نفسیات اور تعلیم کے مسائل تک کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں انداز تخاطب اور جزوی طور پر ایک ڈرامائی انداز سے کچھ ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے موضوع اور انداز دونوں میں ایک جذب وکشش کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔

بچوں میں نقل کرنے کا جو مادہ ہوتا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"بچے میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں ہنستی ہے تو خود بھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ باپ کوئی لفظ بولے تو اس کی آواز کی نقل اتارے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا بڑا ہوتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے تو اپنے ہم جولیوں کو کہتا ہے آؤ بھئی! ہم مولوی بنتے ہیں تم شاگرد ہو، کبھی بازار کے دکان داروں کی طرح سودا سلف بیچتا ہے کبھی پھیر پھیر کر اونچی آواز دیتا ہے کہ "چلے آؤ" "انار سستے لگا دیئے۔ اس وقت میں بڑا ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تا کہ اسے اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔" [۱]

بات صرف اتنی سی ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں استاد کو اپنی شخصیت کو مثالی بنا کر دکھانا چاہیئے تا کہ بچہ اس کی نقل کرے کیونکہ یہ نقل کرنے کا مادہ اس کی جبلت میں شامل ہے۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے اس نفسیاتی اور تعلیمی نکتے کو بچوں کے بعض مشاغل کی تصور کشی

---

[۱] مقالات اقبال (بچوں کی تعلیم و تربیت) صفحہ ۵۔

کرکے زیادہ موثر بنا دیا ہے۔ خاص طور پر اس میں انہوں نے دو ایک مکالموں سے جو ڈرامائی شان پیدا کر دی ہے وہ اسلوب نثر کے سلسلے میں ان کی فن کارانہ چابک دستی پر صداقت کی مہر لگاتی ہے۔

لیکن اس انداز سے ان کے علمی اسلوب نثر کی سنجیدگی مجروح نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے اس انداز سے ان کی معنویت میں وزن پیدا ہوتا ہے اور اظہار و ابلاغ میں جمالیاتی انداز جھلکیاں نمایاں نظر آنے لگتی ہیں۔

علامہ اقبال اپنے علمی اسلوب نثر میں ان جمالیاتی انداز کو نمایاں کرنے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ کہیں تشبیہات و استعارات سے کام لے کر، کہیں بعض تصویروں کی تخلیق کر کے، کہیں لطائف و واقعات کو پیش کر کے، کہیں تفصیل و جزئیات کو حیاتی انداز میں بیان کر کے وہ اپنے اسلوب نثر میں بھی ان جمالیاتی قدروں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں کوئی شعوری کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ یہ تمام پہلو ان کے اسلوب نثر کے تجربے کی مخصوص کیفیت اور جذبے اور تخیل کی خاص تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً تشبیہات و استعارات کی چند مثالیں دیکھئے۔

"زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی علمی کم مائگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔" [1] (اردو زبان پنجاب میں)

"برق جس کی مضطربانہ چمک تہذیب کے ابتدائی مراحل میں انسان کے

۱۔ مقالات اقبال (اردو زبان پنجاب میں) ص ۳۸

دل میں مذہبی تاثرات کا ایک ہجوم پیدا کر دیا کرتی تھی۔ اب اس کی پیام رسانی کا کام دیتی ہے۔ سلیم اس کی سواری ہے اور ہوا اس کے پنکھے جھلا کرتی ہے۔"
(قومی زندگی)

"لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہی ہو منگنی کے بعد تو اس گھر سے ایسا پرہیز کرتا پڑتا ہے جیسے ایک متقی کو مے خانے سے۔"
(قومی زندگی)

"مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئی کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔" [1] (دیباچہ مثنوی اسرار خودی)

ان اقتباسات میں جو تشبیہات و استعارات ہیں وہ نئے اور اچھوتے ہیں اور موضوع کی نسبت سے دیکھا جائے تو ان کو استعمال بھی نئے اور اچھوتے انداز سے کیا گیا ہے۔ ان کے استعمال کا بنیادی مقصد تو دراصل خیال یا تجربے کی وضاحت ہے لیکن تخیل کی رنگ آمیزی نے اس میں کچھ ایسی گل کاریاں کی ہیں اور کچھ ایسے رنگ بکھیرے ہیں کہ طبیعت ان سے اثر قبول کرتی ہے اور اسی طرح احساس جمال کی تسکین کا سامان پیدا ہوتا ہے۔

اقبالؒ کے اسلوب نثر میں بعض جگہ تصویر کشی کے بھی بہت اچھے نمونے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ علمی نکتوں کی وضاحت کرتے ہوئے بعض مثالیں دیتے ہیں، واقعات بیان کرتے ہیں یا لطیفے سناتے ہیں ایسے مواقع پر اقبال کے ہاں کچھ تصویریں ابھرتی ہیں۔ اقبالؒ کا تخیل ان تصویروں میں جان ڈال دیتا ہے اور وہ منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے مسلمانوں کی زبوں حالی، خصوصاً عربوں کی پامالی پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ انہوں نے

۱۔ مقالات اقبال صفحہ ۱۵۴

ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جس سے پورے منظر کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور اس نقشے کو دیکھ کر طبیعت میں رنج و غم کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت ہی نہایت ہی افسوسناک اور قابل رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں معمولی درجے کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا۔ لاہور کے کسی اسلامی محلے میں جا نکلو ایک تنگ و تاریک کوچے پر ہماری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ توگی کی حالت تھی الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کس کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔" [1] (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر)

اس عبارت سے عام مسلمانوں کی مالی بدحالی اور افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پامالی کی پوری تصویر نہ صرف آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے بلکہ حواس پر چھا جاتی ہے۔ خاص طور پر تفصیل و جزئیات کی وہ تصویریں جن میں علامہ اقبال لاغر اور نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار اور پردہ نشین بڑھیا کی برقع میں سے نکلی ہوئی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیوں کو بھی دیکھ لیتے

۱۔ مقالات اقبال صفحہ ۱۳۲-۱۳۹۔

ہیں اور الفاظ میں ان کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ اقبال کو ایسا کرنے میں کمال حاصل ہے نثر میں یہ تصویر کشی درحقیقت وہی محاکات ہے جس کو شاعری میں دیکھا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے علمی اسلوب نثر میں یہ خصوصیت ان کے شاعرانہ مزاج ہی نے پیدا کی ہے۔

اسلوب نثر میں علامہ اقبال کی شگفتہ مزاجی بھی عجیب عجیب گل کھلاتی ہے چنانچہ بعض جگہ وہ اپنے کسی اہم خیال کو واضح کرنے یا کسی علمی نکتے کو لوگوں تک موثر انداز میں پہنچانے کے لئے لطیفوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے جب وہ نام و نمود کی خواہش کی اور اس کے مذموم اثرات کو، (جس نے بیشتر لوگوں میں ایک مرض کی صورت اختیار کر لی ہے) ایک دلچسپ لطیفہ سنا کر واضح کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"منجملہ اور قومی امراض کے ایک بے جا نام و نمودی کی خواہش کا مرض ہے جو عام طور پر ہمارا دامن گیر ہے۔ مجھے اس وقت ایک معنی خیز لطیفہ یاد آیا جس کو بیان کرتے سے رک نہیں سکتا ہمارے سیالکوٹ کے قریب تحصیل وزیر آباد میں ایک بزرگ کیسر شاہ نام کے رہا کرتے تھے۔ رندانہ طریق کے ایک صاحب کرامت درویش تھے اور مراقبہ و وحدت الوجود سے انہیں خصوصیت تھی قرب و جوار کے تمام معززین، ہندو اور مسلمان ان کے حلقہ مریدین میں شامل تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک دیوان صاحب جو ان کے معتقد تھے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی سے فارغ ہو کر حضرت کی زیارت کو آئے اور آتے ہی اپنے نام و نمود کا نقشہ اتارنا شروع کیا۔ وہ بزرگ ان کے اخراجات کی طویل فہرست خاموشی سے سن رہے تھے کہ ایک درویش نے سائیں صاحب کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ حضرت! کھانا تیار ہے۔ سائیں صاحب نے پوچھا کہ نری خشک روٹی ہے یا سالن بھی ہے؟ درویش نے عرض کیا کہ حضرت! اس وقت سالن موجود نہیں۔ حضرت نے دیوان صاحب سے فرمایا کہ ذرا بازار سے جا

کر ایک مولی تو لے آؤ ہمیں یہی سالن کا کام دے گی۔ اتفاقاً دیوان صاحب کی جیب میں اس وقت کوئی پیسہ موجود نہیں تھا۔ ذرا کھسیاتے ہوئے اور سائیں صاحب کے سامنے جو چند کوڑیاں رکھی تھیں انہیں دیکھ کر بولے: "حضرت یہ کوڑیاں دلائیے، میرے پاس اس وقت کچھ نہیں۔" آپ نے فرمایا کہ بیٹے کی شادی پر تم نے جو نام و نمود حاصل کیا ہے وہ دے کے ایک مولی لے آؤ۔ دیوان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے حضرت! بھلا نام و نمود کے عوض میں بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہاتھ آسکتی ہے؟ سائیں صاحب نے اپنے معمولی ظریفانہ طریق میں فرمایا کہ بھائی جس نام و نمود کی قیمت ایک مولی بھی نہیں پڑتی، اس کے حصول سے فائدہ ہی کیا؟ دیوان صاحب نہایت خفیف ہوئے اور آئندہ کے لئے اپنی حرکات سے توبہ کی۔" [1] (قومی زندگی)

اس طرح کے دلچسپ لطیفے یا واقعات علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر میں کہیں کہیں دلچسپ فضا پیدا کرتے ہیں لیکن ان سے کسی اہم نکتے کی وضاحت ضرور ہوتی ہے۔ اقبال کے اسلوب نثر کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ سنجیدہ علمی موضوعات کو بھی دلچسپ اور پُر لطف بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مقصد اس کا یہی ہے کہ ان کے خیالات و تجربات مؤثر ہوں اور پڑھنے والا ان کو ذہنی طور پر قبول کر کے اپنی شخصیت کا جز بنا لے۔

غرض یہ کہ علامہ اقبال کے علمی اسلوب میں سنجیدگی، باقاعدگی اور منطقیت کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور شادابی کے عناصر بھی ملتے ہیں، جن کو وہ مختلف طریقوں سے پیدا کرتے ہیں۔ کبھی الفاظ کے مخصوص استعمال سے روانی کو پیدا کر کے، کبھی تشبیہات و استعارات سے کام لے کے، کبھی جاندار تصویروں کی تخلیق کر کے اور کبھی دلچسپ لیکن سبق آموز لطیفے سنائے لیکن

۱۔ مقالات اقبال (قومی زندگی) صفحہ ۵۹۔

اس سے ان کے اسلوب کی سنجیدگی کو ٹھیس نہیں لگتی۔ برخلاف اس کے اس کا تناؤ اس انداز کی وجہ سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔

(۵)

سنجیدگی سے ملی ہوئی شگفتگی اور شادابی علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی نمایاں ترین خصوصیت ہے علمی اور فلسفیانہ موضوعات تک کی ترجمانی میں ان کے ہاں اس کے اثبات ملتے ہیں حالانکہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہوئے شگفتگی اور شادابی کو پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا اقبالؔ نے اپنی نثر میں یہ سنگم بنایا اور اس طرح علمی نثر لکھنے کا نیا تجربہ کیا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی شخصیت کی شادابی اور شاعرانہ مزاجی ہے اور دوسرے اس ماحول کا اثر ہے جو اس زمانے کی نثر نگاری میں مخزن کی تحریک کے زیر اثر قائم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول کی محرک رومانیت کی تحریک تھی جس کو افادی رجحان کے ردعمل نے پیدا کیا تھا اور مخزن جس کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔

علامہ اقبالؒ کی علمی نثر میں تو اس انداز کی صرف جھلکیاں موجود ہیں لیکن ان کی ادبی اور تنقیدی نثر میں تو اس شگفتگی اور شادابی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کیفیت کو اقبالؒ کبھی رومانی شاعروں کا ذکر کر کے، کبھی ان کے خیالات کا تجزیہ کر کے، کبھی ان کے رنگین ماحول کا بیان کر کے کبھی جذبے اور تخیل کی آمیزش سے ایک رنگین سی فضا پیدا کر کے کبھی رعنائی سے بھرپور الفاظ کو استعمال کر کے، کبھی اچھوتی تشبیہات اور نئے استعارات سے کام لے کے اور کبھی الفاظ کو تصویروں کا روپ دے کر پیدا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کی بہترین نثر یہی ہے۔

"جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ" علامہ اقبال کا مختصر سا تنقیدی مضمون ہے لیکن اس مختصر سے مضمون میں بھی انہوں نے جو کچھ کہا ہے اور جس انداز سے

کہا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے شادابی ٹپکتی ہے اور ساتھ ہی زندگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی شاعر عنترہ کے ایک شعر کو پسند فرمایا۔ اس کا ذکر کرکے علامہ اقبال لکھتے ہیں۔

"اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دینوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا، خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اس شعر میں ایسی کون سی بات کہی تھی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت مند زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں، ان کا نقش پردہ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجہ دو جہاں صلعم نے جو اس قدر شعر کی تعریف کی اس نے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیات انسانی کے تابع ہے، اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

"ہر وہ استعداد جو مبدا فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصد وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے، یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز، جوش سے سرشار، ہر انسانی صنعت اس غایت آخریں کی تابع اور مطیع ہونی چاہیئے اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ

انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو چغتائی بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔" [1] (جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ)

یہ طویل اقتباس صرف اس خیال سے یہاں دیا گیا ہے کہ اس سے علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر کی اس خصوصیت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس میں حیرت و استعجاب کی وہ آواز ہے جو دلوں میں ولولوں کو جگاتی اور حوصلوں کو بیدار کرتی ہے۔ پھر شاعر نے زندگی کے تصور کو جس طرح حوصلے اور ولولے سے آشنا کیا ہے اس کی تصویر کشی بھی الفاظ کے نہایت جاندار رنگوں میں ملتی ہے۔ پھر انسان کی غفلت اور تساہلی کو جس طرح اونگھنے سے تعبیر کیا گیا ہے اور بے عملی کو جس طرح چغتائی بیگم کا عشق کہہ کر وضاحت کی گئی ہے اس نے مجموعی طور پر اس عبارت کو خاصا پُرکار بنا دیا ہے۔

ایک اور جگہ شاعری اور اس کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اس روشنی میں حافظ کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ اس طرح تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

"شاعری نام ہی اس کا ہے کہ اشیاء و مقاصد کو اصلیت سے حسین تر بنا کر دکھایا جائے تاکہ اوروں کو اب اشیاء و مقاصد کی طرف توجہ ہو اور قلوب ان کی طرف کھینچ آئیں۔ ان معنوں میں ہر شاعر جادوگر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کس کا جادو کم چلتا ہے کسی کا زیادہ۔ خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے مقصد یا حالت یا خیال کو محبوب بناتے ہیں۔" (اسرار خودی اور تصوف)

یہ تنقیدی جملے خاصے شاداب ہیں۔ ان میں خود وہ ادبیت ہے جو تنقید کو تخلیق بناتی

۱۔ مقالات اقبال (جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ) صفحہ

ہے۔ اس میں قلوب کے کھینچنے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے، شاعر کو جس طرح جادوگر بنایا گیا ہے اور حافظ کی شاعری کو جس طرح ساحری سے تعبیر کیا گیا ہے، اس نے اس عبارت میں ایسی پرکاری پیدا کی ہے جو دلوں کو متاثر کرتی ہے۔

اس اسلوب کی ایک مثال اور دیکھئے۔ پیام مشرق کے دیباچے میں گوئٹے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"۱۸۱۲ء میں فان ہیمبر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اس ترجمے کی اشاعت سے جرمنی ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کے بیتاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکوں میں اپنے لئے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کر لی۔ مگر فان ہیمبر کا ترجمہ گوئٹے کے لئے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و غریب خیال کا ماخذ بھی تھا۔ بعض جگہ اس کی نظر خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرعہ کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔"[1] (دیباچہ پیام مشرق)

یہ خاصی رنگین پرکار اور شاداب نثر ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع ادبی تنقید ہے لیکن

۱۔ مقالات اقبال (اسرار خودی اور تصوف) صفحہ ۲۰۳۔

اس میں وہ خشکی اور کاٹ کی خصوصیات نہیں جو عام طور پر بیشتر تنقیدی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں تو علامہ اقبال کی شاعرانہ مزاجی نے اسلوب نثر کے لحاظ سے ایک نہایت ہی لطیف سا ماحول پیدا کر دیا ہے اور ایک رنگین سی فضا قائم کر دی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اقبال سب سے پہلے ایک شاعر اور فن کار ہیں۔ اسی لئے اس معاملے میں بھی جذبے کی تحریک ان کے ہاں تخیل کی پرواز سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور ان کے اسلوب نثر کو نہ صرف ایک ذہنی تجربہ بلکہ ایک جذباتی تجربہ بھی بنا دیتی ہے جس کے نتیجے میں ان کا اسلوب نثر ایک تخلیقی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس پر جان مڈلٹن مرے کا یہ خیال صادق آتا ہے کہ اسلوب بیک وقت ایک ذہنی اور جذباتی تجربہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال رح کی ادبی اور تنقیدی تحریروں میں اس تجربے کی نہایت حسین صورتیں نظر آتی ہیں اور اس کی بدولت ان کا اسلوب نثر رنگینی اور رعنائی، شگفتگی اور شادابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

(۶)

اسلوب نثر کی یہ خصوصیت، اس میں شبہ نہیں، کہ علامہ اقبال کی ادبی اور تنقیدی تحریروں میں خاصی نمایاں نظر آتی ہے، لیکن تنقید کے بہرحال اپنے کچھ حدود ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں رنگین اور پرکار اسلوب نثر کا وہ معیار نہیں پیدا ہو سکتا جو ہلکی پھلکی بیانیہ یا افکاہی تحریروں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اقبال کی بیانیہ یا افکاہی نثری تحریریں مقدار میں ایسی کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ پھر بھی ان کے دو مختصر سفرناموں جو لندن سے خطوط کی صورت میں لکھے گئے ہیں اور بعض دوسرے خطوط میں اس اسلوب نثر کے بعض بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو رنگین اور پرکار اسلوب نثر، ان میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ کہیں اشیاء یا واقعات کے

بیان میں، کہیں جذبات و احساسات کی ترجمانی میں، کہیں خیال اور تخیل کی عکاسی میں، کہیں لطیف انسانی معاملات کی تصویر کاری اور پیکر تراشی میں اور کہیں عام معمولی باتوں سے متعلق لطیف احساس مزاح کی مصوری میں علامہ اقبال کے ہاں اس رنگین اسلوب نثر کے بعض بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں۔

اس اعتبار سے علامہ اقبالؒ کے وہ دو خطوط خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں جو لندن کے سفر کے دوران انہوں نے اخبار وطن کے ایڈیٹر کو لکھے۔ یہ خط اگرچہ مفصل نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود جامع ہیں اور وہ خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

اقبالؒ کی ان نثری تحریروں میں سب سے پہلے ہماری نظر مناظر کی مصوری پر پڑتی ہے مشاہدے اور محسوسات کے امتزاج نے ان مناظر کی ترجمانی میں مصورانہ شان کو پیدا کیا ہے اور اس طرح اس میں تاثر کی ساحری کے اثرات بڑھ گئے ہیں۔

دہلی کے کھنڈروں سے متعلق ایک تاثر کو ان چند جملوں میں علامہ نے کیسی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامن دل کو کھینچتے ہیں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا، شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں فاتحہ پڑھی۔ دارا شکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں میں ہو الموجود کی آواز سنی اور دہلی کی عبرتناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاق اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحہ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔" [1] (اقبال کے دو خطوط)

آگے چل کر اسی خط میں لندن وکٹوریا ڈاک کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

"میں عبنیٔ یعنی باب لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں۔ خدا جانے لندن

۱۔ مقالات اقبال (اقبال کے دو خطوط) صفحہ ۶۴۔

کیا ہوگا جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔ اچھا [illegible] ۔ ۷۔ ستمبر کو ۲ بجے ہم وکٹوریا ڈاک دگھاٹ پر پہنچے، جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سینکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈر۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح وسلامت منزل مقصود پر پہنچا دیں گے۔"

اور سمندر کی کیفیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

"راستے میں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اس نظارے کی یکسانیت سے اکتانے لگی۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں جو زور سے اٹھتی ہیں ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہے اور دور دور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے سے بکھیر ڈالے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت دلفریب ہے۔"[1]

اور سویز کینال کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔ محمد دین فوق کو ایک خط میں لکھتے ہیں

"آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کینال میں داخل ہوا۔ یہ کینال جسے ایک فرانسیسی انجنیئر نے تعمیر کیا تھا دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ کینال کیا ہے عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس طرح اس مغربی اختراع نے زمانہ حال کی تجارت پر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی۔ جس نے حال کی دنیا کی

۱۔ مقالات اقبال صفحہ ۱۷۔

تہذیب و تمدن کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ بعض بعض جگہ تو یہ کینال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں گزر سکتے ہیں اور کسی کسی جگہ ایسی بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پُر کر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے۔" [1]

ان اقتباسات میں منظر نگاری ہے۔ ان مناظر کے نقشے ہیں جن کا علامہ نے مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن کہیں زیادہ کہیں کم ان میں محسوسات کا عنصر غالب ہے اور یہی خصوصیت ان میں ایک پہلو دار کیفیت کو پیدا کرتی ہے اور اسی کے ہاتھوں رنگین اور پرکار اسلوب پیدا ہوتا ہے۔ دہلی کے کھنڈروں کا دامن دل کو کھینچنا، ہمایوں کے مقبرے میں داراشکوہ کے مزار کی خاموشی میں کانوں میں ہوالموجود کی آواز کا سنائی دینا اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک اخلاقی اثر لے کر رخصت ہونا، ڈکٹوریا ڈاک میں کھڑی ہوئی کشتیوں کو یہ کہتے ہوئے محسوس کرنا کہ سمندر کی وسعت سے نہیں ڈرنا چاہیئے، وہ انہیں صحیح سلامت پہنچا دیں گی، سمندر کے سفید جھاگ کا موجوں کو چاندی کی کلغی سی پہنانا اور سویز کینال کو عرب اور افریقہ کی جدائی اور مشرق و مغرب کا اتحاد تصور کرنا۔ یہ سب باتیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ اس اسلوب نثر کا خالق صرف الفاظ ہی سے نہیں کھیل رہا ہے اور صرف مناظر ہی کا مشاہدہ نہیں کر رہا ہے بلکہ محسوسات میں خود سمندر کا سا طوفان اٹھا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مناظر کی تصویر کشی میں علامہ کے ہاں جذبے اور تخیل کی جھلکیاں نظر آتی ہے اور یہ دونوں عناصر مل کر ان کے بیان میں رنگینی اور پرکاری کے رنگ بھرتے ہیں۔

اب اس اسلوب نثر کے صرف دو اقتباسات اور دیکھیئے۔ جن میں مشاہدے کی شدت جذبے کی ہیجان انگیزی اور تخیل کی بلندی اور بلند پروازی، یہ سب مل کر نہ صرف چند مناظر کو آنکھوں

۱- اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۲۶۹۔

کے سامنے پیش کر دیتے ہیں بلکہ واردات و کیفیات کی چند ایسی تصویروں کو بھی بے نقاب کر دیتے ہیں جو ہنسے بولتی بھرتی نظر آتی ہیں اور جن میں نثر نگار اپنے خیالات و نظریات، جذبات و احساسات اور ادراک و شعور کے گہرے رنگ ور ڈال دیتا ہے۔ الفاظ، لہجہ اور انداز نثر کے ان اقتباسات میں دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تصویر تر جہاز کے ایک منظر کی ہے جس میں عورتیں اور مرد دائمن بجا رہے ہیں۔ علامہ اقبال ؒ نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"یہاں جو پہنچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختۂ جہاز پر تین اطالین عورتیں اور مرد دائمن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہو گی نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانتداری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے حسن نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر سخت اثر کیا لیکن جب اس نے چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا۔ کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔" [1]

یہ ایک منظر کی سیدھی سادی سی تصویر ہے جس میں تخیل کے رنگ زیادہ گہرے نہیں ہیں لیکن یہ تصویر ابھری ہوئی ضرور ہے۔ یہ جاندار ضرور ہے۔ اس میں زندگی اور اس کے بعض سنگین حقائق کے خط و خال بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ اقبال نے اس میں نظریے اور خیال کا رنگ بھر کر اس کو زیادہ جاندار بنا دیا ہے۔ اس عبارت میں صرف ایک تشبیہ استغنا کا غازہ آئی ہے۔ باقی تمام عبارت تشبیہات و استعارات سے خالی ہے۔ الفاظ بھی رنگین نہیں ہیں۔ البتہ خیال اور احساس نے اس تصویر کو رنگین بنا دیا ہے۔

۱۔ مقالات اقبال، صفحہ ۷۶۔

دوسرا اقتباس اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ جاندار رنگین اور پرکار ہے کیونکہ اس میں جذبہ زیادہ شدید ہے، تخیل کی پرواز زیادہ بلند ہے اور اظہار زیادہ مرصع ہے۔ لندن کے سفر میں جب عرب کی سرزمین پر علامہ کا جہاز پہنچتا ہے تو ان کے دل میں عقیدت اور جذباتی وابستگی کی ایک لہر سی اٹھتی ہے اور الفاظ اور زبان بلکہ مجموعی طور پر پورے اسلوب کو مرصع رنگین اور پرکار بنا دیتی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں۔

"اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیادت سے اپنی آنکھوں کو منور کر لوں۔"

اللہ نے خاک پاک مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

"اے عرب کی مقدس سرزمین! خدا جانے تجھ پہ کیا افسوں پڑھا دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالیوں نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا۔ لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی مگر اے پاک سرزمین! تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھلوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں دلہوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذرّوں میں

مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میں زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامونوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوں، اس پاک سرزمین میں پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال رضؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"[۱]

اس میں جذبے کی جو شدت ہے اور تخیل کی جو پہلو دار کیفیت ہے اس نے اس نثر کو دو آتشہ بنا دیا ہے اور ساتھ ہی اس میں جولانی کی بجلیاں بھر دی ہیں۔ یہ تو اچھی خاصی شاعری ہے جو نثر میں کی گئی ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کو اچھی نثر نہ تصور کیا جائے۔ یہ اعلیٰ درجے کی شاعرانہ نثر ہے اور اس میں اقبالؒ کی شخصیت کا ہیجان اور زیر و بم پوری طرح سمویا ہوا ہے۔ دوسرے جو حالات اقبال کے آس پاس موجود تھے اور جس میں خاصی ہیجان کی کیفیت تھی، اس کے اثرات بھی اس میں نمایاں طور پر جھلک رہے تھے

دراصل اس قسم کی نثر کو اقبالؒ کے ہاں ان رومانی اثرات نے پیدا کیا ہے جو ان کے عہد میں ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں موجود تھے۔ اقبالؒ کے ہاں ابتداء ہی سے اس تحریک کے اثرات موجود تھے اور ان کی علمی نثر تک اس رجحان سے دامن نہیں بچا سکتی تھی بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں اقبالؒ کے ہاں اس کا بچپن نظر آتا ہے پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر جوانی چڑھتی ہے اور اس کی جوانی دیر تک اقبالؒ کی نثر میں قائم رہتی ہے۔ علمی نثر تک میں اس رجحان کا اثر نمایاں رہتا ہے لیکن جب اقبال بیانیہ یا فکاہی نثر لکھتے ہیں تب تو یہ رجحان ان کی نثر میں آسمان پر پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

سرزمین عرب کے بارے میں نثر کا یہ اقتباس اس صورت حال کا ترجمان اور عکاس ہے جس سے علامہ اقبالؒ کے رنگین اور پرکار اسلوب نثر کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔

۱۔ مقالات اقبال ص ۷۴-۷۵۔

(۷)

علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر کی جو تنقیدی تصریحات و تفصیلات اب تک پیش کی گئی ہیں ان کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ اقبال نے مختلف موضوعات پر جو نثر لکھی ہے اس میں موضوعات کی نسبت سے انداز بیان میں تھوڑا سا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن دیکھے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی طبیعت کا میلان رنگین اور پرکار اسلوب کی طرف زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

ایمان کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال رومانیت کی تحریک کی پیداوار ہیں ان کی شاعری اور ان کی نثر دونوں میں اس رومانیت کے اثرات ابتدا ہی سے ملتے ہیں۔ طبعاً بھی وہ رومانی تھے۔ اسی لئے انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے تخیل سے کام لیا اور اس کا اظہار بھی تخیل کی رنگینی کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمی موضوعات تک کی ترجمانی میں وہ ایک ایسے اسلوب نثر سے کام لیتے ہیں جس کو ان کا تخیل رنگین اور پرکار بناتا ہے ظاہر ہے کہ علمی موضوعات کے اظہار و ابلاغ میں یہ رنگینی اور پرکاری دوسرے موضوعات کی ترجمانی کے مقابلے میں نسبتاً کم نمایاں ہوتی ہے۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ اصولی اور نظریاتی طور پر موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی کے قائل ہیں اور انہوں نے عملی طور پر اس کو اپنے اسلوب میں برتا بھی ہے۔ اسی لئے مختلف موضوعات کو پیش کرتے ہوئے وہ اس اسلوب سے کام لیتے ہیں جو موضوع کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ اور علمی موضوعات کے لئے ان کے ہاں نسبتاً زیادہ سنجیدہ اسلوب نثر ملتا ہے لیکن ادبی اور تنقیدی موضوعات کے لئے ایسے اسلوب نثر سے کام لیتے

ہیں جس میں شعریت اور ادبیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور ہلکے پھلکے عام انسانی معاملات کی ترجمانی کے لیئے وہ ایسا اسلوب نثر استعمال کرتے ہیں جو سنجیدگی سے گرانبار نہیں ہوتا برخلاف اس کے رنگین اور شگفتہ اسلوب نثر سے کام لیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے ہاں نثر کے کئی اسالیب ملتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اسلوب تو ان کے ہاں ایک ہی ہے جو ان کی شخصیت کا عکس ہے لیکن اس میں موضوع کی مناسبت سے کچھ جزوی تبدیلیاں علامہ اقبال اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے ہاں یک رنگی کے بجائے رنگا رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً جہاں جذباتی معاملات کا بیان ہوتا ہے وہاں زور بیان کے نتیجے میں روانی اور بہاؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اگر کہیں تخیل کے زیر اثر پیدا ہونے والے معاملات کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں رنگینی اور پُرکاری کے اثرات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اقبال کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ ان سب کو اپنے حدود میں رکھتے ہیں۔ اسی لیئے ان کا اسلوب نثر موضوع کے ساتھ مناسبت کا صحیح نمونہ معلوم ہوتا ہے۔

زبان و بیان پر علامہ اقبال کو جو قدرت حاصل ہے وہ موضوع اور اسلوب کے درمیان مناسبت پیدا کرنے میں بڑا اہم کام انجام دیتی ہے۔ یوں اقبالؒ زبان کے معاملے میں حد درجہ عاجزی اور انکساری سے کام لیتے ہیں۔ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ زبان پر قدرت نہیں رکھتے اور اس زبان میں گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گزری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر

کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا۔" [1]

حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ان کی نثری تحریریں صاف طور پر یہ بتاتی ہیں کہ وہ اردو زبان پر پوری گرفت رکھتے تھے اور موضوع کی مناسبت سے زبان کا استعمال ان کا مزاج بن گیا تھا۔ بڑے سے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ فلسفیانہ، تہذیبی اور عمرانی، معاشی اور اقتصادی مسائل کو وہ مناسب زبان میں ادا کر سکتے ہیں۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ اپنی نثری تحریروں میں اردو روزمرہ اور محاورے کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خیال بھی مضحکہ خیز حد تک تنگ نظری پر مبنی ہے کہ انہوں نے علمی نثر اس لئے اچھی لکھی کہ وہ اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال فطرتاً اور طبعاً نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کے مہمل خیالات ظاہر کرنے والوں کو اقبالؒ کی عظمت کا احساس ہونا چاہیئے۔ اردو زبان کے ساتھ انہیں جو لگاؤ تھا۔ اسلامیان ہند کی تہذیب سے انہیں جو گہری دلچسپی تھی اور اس زبان کو ترقی اور فروغ دینے کے لئے جو کچھ وہ کرتے تھے اور کرنا چاہتے تھے اور جس کے عشق میں وہ یہ تک کہنے کے لئے مجبور ہو گئے تھے کہ "میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے" اس شخص کے بارے میں اس طرح سوچنا ایک ایسا جرم ہے جس کو ادبی تنقید کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

علامہ اقبالؒ نہ صرف اردو زبان کے ماہر بلکہ اس کے فن کار تھے وہ اس کی گرامر نہ جانتے ہوں یا اس گرامر سے انہیں دلچسپی نہ ہو، لیکن اس زبان کی مزاج دانی کا شعور ان کے ہاں موجود تھا۔ بلکہ گرامر کا نہ جاننا یا اس سے دلچسپی نہ لینا تو اس بات کی دلیل ہے کہ بحیثیت ایک ادبی زبان کے وہ اس کے مزاج داں تھے اور اس کو استعمال کرنے پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی۔ زبان داں کے لئے اپنی زبان کی قواعد اور گرامر کا جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ تحقیق ادب کی سطح میں

۱۔ اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۷۴۔

تو زبان کا استعمال کچھ اور ہی تقاضے کرتا ہے۔

ان تقاضوں کو علامہ اقبالؒ نے اپنی نثر نگاری میں پورا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب نثر کو ان حالات یا ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جس کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب نثر ہر جگہ اپنے موضوع کے ساتھ مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے اور جو زبان وہ استعمال کرتے ہیں، جن الفاظ کے ذریعے اپنے تجربات کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں جو لہجہ اختیار کرتے ہیں اور جس مخصوص آہنگ سے کام لیتے ہیں وہ خیال، تجربے اور نظریے کی تصویروں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے اور اس میں ان کے اسلوب نثر کی بڑائی ہے۔

زبان کے استعمال میں اقبالؒ کے ہاں تنوع اور رنگا رنگی ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں ایک وحدت کا احساس ہوتا ہے اور یہ وحدت زبان کے صحیح استعمال، الفاظ کی موسیقیت، جملوں اور فقروں کی روانی عبارت کے بہاؤ، تصویروں کی تخلیق، تشبیہات و استعارات کی مرصع کاری اور مجموعی طور پر اسلوب نثر کو رنگینی اور پرکاری سے ہم کنار کرنے کی خواہش میں نظر آتی ہے اور یہ آخری بات یعنی رنگینی اور پرکاری کی خواہش اور آرزو کا احساس تو ان کی نثر میں ہر جگہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ان کی نثر ادبیت سے ہمکنار ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس میں ایک شاعرانہ رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

موضوع کی مناسبت سے زبان کے فن کارانہ استعمال کی جو صورتیں علامہ اقبالؒ کی نثر میں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، ان کا اندازہ ان چند اقتباسات نثر ہی سے ہو سکتا ہے۔

"ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں جو زبان علامہ نے استعمال کی ہے وہ علمی موضوع پر ان کے اسلوب نثر کی صحیح نمائندگی کرتی ہے اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قانون انتخاب فطری کے اکتشاف عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا۔ حالانکہ پہلے اس تاریخ کے

واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق لادراک سلسلے سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً ماورا ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہو کر گہوارہ شہود میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے، اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دقت سے نظر کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی جیاں آفرینیاں ڈارون کے مقدمہ حکمت کا تتمہ ہیں جب حیات کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا انکشاف کیا تو مدنی زندگی کے عمرانی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔" [1]

اس اقتباس میں فلسفیانہ، عمرانی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی موضوعات پر اظہار خیال ہے۔ اسی وجہ سے اس میں ایک مفکرانہ سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کی گرفت زبان و بیان پر بہت سخت ہے۔ وہ مناسب علمی اصطلاحات کو صحیح معنویت کے ساتھ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان کا مافی الضمیر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس عالمانہ سنجیدگی اور علمی اصطلاحات کے باوجود لکھنے والے کا رجحان ادبیت اور شعریت کی طرف نظر آتا ہے۔ اسی لئے تو وہ اس قسم کے جملے لکھتے ہیں کہ "تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے فوق الادراک سلسلے سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً ماورا ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے، جن کے شاعرانہ رنگ و آہنگ سے کوئی بدذوق ہی انکار کر سکتا ہے۔

اب ایک اقتباس اور دیکھئے جو مذکورہ بالا خیال کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ "قومی زندگی

۱۔ مقالات اقبال ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر صفحہ ۱۱۶۔

پر اظہار خیال کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں۔

"مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو حیات مسیح یا آیات ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لیے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم بحث چھڑ جاتی ہے، تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ! پرانا علم و فضل جو علمائے اسلام کا خاصا تھا نام کو بھی نہیں۔ ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دست خاص سے اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہاں امراء کی عشرت پسندی کی داستان سب سے نرالی ہے۔ خیر سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے پہلے سے ہیں، ابھی میاں تیسری بیوی کی تلاش میں ہے اور پہلی دو بیویوں سے پوشیدہ کہیں کہیں پیغام بھیجتے رہتے ہیں۔ کبھی گھر کی جوتی بیزار سے فرصت ہوئی تو بازار سے کسی حسن فروش نازنین سے بھی گھڑی بھر کے لئے آنکھ لڑا آئے۔ اول تو کسی کو جرأت نہیں کہ حضرت کو نصیحت کرے اور اگر کسی کو لب کشائی کا حوصلہ ہو تو جیں بہ جبیں ہو کر ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

(قومی زندگی)

یہ علمی اور سنجیدہ مضمون کا اقتباس ہے لیکن اس میں انداز کا تیکھا پن بھی ہے، شوخی بھی ہے، محاورے اور روزمرہ کا برمحل استعمال بھی ہے جس سے یہ تحریر نثر کا اعلیٰ نمونہ بن جاتی ہے لیکن رنگین اور پرکار شاعرانہ اسلوب اس میں بہرصورت غالب رہتا ہے اس لئے کہ یہ علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر کی بنیادی خصوصیت ہے۔

زبان و بیان اور روزمرہ اور محاورے کا صحیح استعمال علمی موضوعات میں شاعرانہ اسلوب نثر کو کس طرح پیدا کرتا ہے، اس کی وضاحت اس اقتباس سے پوری ہو جاتی ہے۔ ملت

بیضا پر ایک عمرانی نظر، میں جماعت یا قوم کو نئے تہذیبی اور سائنسی حالات سے آشنا ہونے کی صورت میں جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کی تصویر علامہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

"میں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہوں کہ زمانۂ حال میں بھی کسی جماعت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعے سے نشوونما پانا محال ہے۔ ریل اور تار نے زمان و مکان کے پردے کو درمیان سے اٹھا سا دیا ہے اور دنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے بعد المشرقین حائل تھا، اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں اور اس ہم نشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی حالت بدل کر رہ جائے گی اور بعض قومیں بالکل ہی ملیامیٹ ہو جائیں گی۔" [1] (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظم)

صحیح زبان کے استعمال، روزمرہ اور محاورے کے چٹخارے، اور تشبیہات و استعارات سے بھرپور سامانِ زیبائی نے اس عبارت کو سنجیدگی، ثقاہت اور علمیت کے باوجود، ایسا رنگین اور پرکار بنا دیا ہے کہ اس میں شاعری کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر کا عام انداز یہی ہے اور اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اقبال زبان و بیان کا استعمال بڑی مشاقی کے ساتھ کرتے ہیں۔ روزمرہ اور محاورے کا استعمال ان کے ہاں فن کاری کی صورت میں نظر آتا ہے اور علمی موضوعات کو تخلیقی انداز بیان سے آراستہ پیراستہ کر کے پیش کرنا اس طرح کہ خیال اور تجربہ شاعری سے رنگین اور شعریت سے پُرکار ہو جائے۔ علامہ اقبالؒ کے اسلوب نثر کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

غرض یہ کہ علامہ اقبالؒ نے ایک ایسا اسلوب نثر پیدا کیا ہے جس میں موضوع اور طریقۂ اظہار کی مکمل ہم آہنگی ہے اور جہان کی طبیعت کی رومان پسندی اور مزاج کی رنگین کاری کی وجہ سے ایسا رنگین اور پُرکار ہے کہ شاعری سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔

۱۔ اقبال نامہ (قومی زندگی)، صفحہ ۱۳۷

(۸)

علامہ اقبالؒ کے اس اسلوب نثر میں کئی تحریکوں اور کئی رجحانات و میلانات کا عکس ہے اس میں مغرب کی فلسفیانہ اور مفکرانہ تحریروں کے اثرات بھی موجود ہیں، اور مشرق کی فلسفیانہ دینی اور مفکرانہ تحریروں کی چھاپ بھی خاصی نمایاں نظر آتی ہے۔ علامہ نے مغرب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور مشرقی مفکرین بھی ان کے سامنے رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ اثر انہوں نے سرسید اور ان کے رفقاء خصوصاً حالی، شبلی اور نذیر احمد سے قبول کیا ہے چنانچہ جو موضوعات انہوں نے اپنی نثر کے لیے منتخب کیے ہیں، ان کا تعلق بھی مشرق و مغرب کے مفکرین، اور سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کے موضوعات و مضامین سے ہے۔ معاشیات و اقتصادیات، فلسفہ تصوف، تعلیم و تربیت، معاشرت اور تہذیب، تمدن اور ثقافت، ادب اور شاعری، ان تمام موضوعات پر علامہ اقبالؒ سے قبل اور ان کے زمانے میں لوگ لکھتے رہے تھے۔ اقبالؒ نے اس فضا سے اثر قبول کیا اور اپنے زمانے کے ان معاملات و مسائل کی طرف توجہ کی۔ اس کا نتیجہ ان کی نثر کی اور اسلوب نثر کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔

اقبالؒ اپنے عہد کی پیداوار تھے لیکن انہوں نے اپنے عہد کو پیدا بھی کیا۔ مطلب یہ کہ انہوں نے اپنے زمانے کی تحریکوں سے اثرات قبول کر کے، اپنے فکر و خیال اور انداز اسلوب سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن میں ایک اجتہادی شان اور ایک نئی آن بان تھی۔ فلسفے میں انہوں نے اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ قومی اور ملی مسائل کو سلجھانے میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ کارزار حیات میں انہوں نے خودی اور خود اعتمادی کے پیغام کو عام کیا اور افراد کے ہاتھوں میں عمل اور ذوق یقین کے پرچم دے دیئے۔ یہ کام انہوں

نے بیشتر اپنی شاعری کے ذریعے انجام دیا لیکن جب ضرورت پیش آئی تو ان موضوعات کی فلسفیانہ تحلیل کے لیے انہوں نے نثر کو بھی استعمال کیا اور یہ نثر ان کے یہاں ایک تخلیقی عمل کی صورت اختیار کر کے، ایک فن بلکہ فنِ لطیف بن گئی۔

نثر اور اسلوب نثر کو فن اور فن لطیف بنانے میں علامہ اقبالؒ کی اس شخصیت کا بڑا ہاتھ ہے جو نورِ بصیرت، آدابِ خود آگاہی، ذوقِ یقین، نالہ ہائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی سے مرکب تھی۔ اس کے اثرات ان کی نثر میں بھی نمایاں ہیں۔ اس میں فکر ہے، جذبہ ہے، احساس ہے، شعور ہے اور زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو حسن و جمال سے آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کرنے کا شعوری اور غیر شعوری احساس ہے۔ ان کے اسلوب نثر کا خمیر انہیں تمام چیزوں سے اٹھا ہے اور ان سب کے اثرات مختلف زاویوں سے ان کی نثر اور اسلوب نثر میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس میں سنجیدگی کے ساتھ لطافت کی جو بنیادی خصوصیت نظر آتی ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

عہد اقبالؒ اسلامیان ہند کی نشاۃ الثانیہ کا دور ہے اس کا آغاز تو شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلویؒ کی تحریکوں سے ہو چکا تھا لیکن سر سید نے اس تحریک کے ہاتھوں میں ایک پرچم دے دیا اور اس طرح اسلامیان ہند کی ملت کے اس قافلے نے آگے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ سیف و قلم کے ایک سے ایک جانباز اس میں شریک رہے۔ انیسویں صدی میں سر سید کے ساتھ حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک اور چراغ علی وغیرہ سب اس نشاۃ الثانیہ کے علمبردار تھے اور ان کی تحریریں اس نشاۃ الثانیہ کی ترجمان اور عکاس ہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کے سپاہی تھے اس لئے ان کے قلم نے تلوار کا کام بھی کیا۔

علامہ اقبالؒ نے آنکھ کھولی تو فضا میں نشاۃ الثانیہ کی اس تحریک کے پرچم لہراتے ہوئے دیکھے اور ملت اسلامیہ کے سپاہیوں کے قلم میں انہیں تلوار کی کاٹ نظر آئی۔ ان کا دل ملت اسلامیہ کے درد سے معمور تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی اپنے قلم میں تلوار کے جوہر پیدا کئے اور مختلف موضوعات

پر جاندار نثر لکھی۔ اس نثر میں بڑی زندگی ہے، بڑا زور ہے، بڑی ہی جولانی ہے اس میں خاص طرح کی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی رواں دواں قسم کی نثر ہے۔ اس میں بلا کی روانی ہے، غضب کا بہاؤ ہے یہ اور بات ہے کہ اس میں پہاڑی ندی کا سا شور نہیں ہے بلکہ میدانوں میں بہتی ہوئی ندی کا سا ترنم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہنگامے کی پیداوار نہیں ہے۔ اسی لئے تو اس میں روانی، بہاؤ اور کاٹ کے باوجود اس شائستگی اور تہذیب کا احساس ہوتا ہے جس کا منبع احساس توازن ہے۔

ہو سکتا ہے بعض لوگوں کو اس بات سے اختلاف ہو لیکن ہے یہ حقیقت کہ ترنم کی یہ دولت اقبال کو اس صورتحال نے عطا کی ہے جو حقیقت پسندی اور رومانیت کے گلے ملنے کے نتیجے میں بیسویں صدی کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی۔ اقبال رح نے اس عہد کی آواز کے ساتھ اپنی آواز کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس آواز میں رس ہے، رعنائی ہے، موسیقیت ہے، ایک غنائی کیفیت ہے، یہ فضا میں گونجتی ہے تو نغمے سے پھوٹتے ہیں، رنگ سے بکھرتے ہیں اور ان نغموں اور رنگوں سے ساری فضا مترنم، رنگین اور پُرکار سی ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال رح کا اسلوب نثر اسی کیفیت کا علمبردار اور اسی صورتحال کا آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی دو معرکتہ الآرا تصانیف

اردو شاعری کا مزاج

"یہ خیال انگیز کتاب حقیقتاً ایک مفید عطا کی حیثیت رکھتی ہے اور شاید اپنی نوعیت کا مفید کارنامہ ہے" — ڈاکٹر سیّد عبدُ اللہ

"اس سے بہتر کتاب پاکستان کی حیاتِ نو میں شاید ہی لکھی گئی ہو"
— عبد الرحمان چغتائی

"یہ کتاب اُردو کے تنقیدی ادب میں ایک نئے اُفق کی طرف رہنمائی کرتی ہے" — مجید امجد،

نیا ترمیم شدہ ایڈیشن — آفسٹ طباعت

اُردو ادب میں طنز و مزاح

"فاضل مُصنّف نے مزاح کی تقدیر و تحسین اور انتقاد کا ایک نیا باب کھولا ہے" — سیّد عابد علی عابد

"طنز و مزاح پر یہ کام بالکل نیا اور اچھوتا ہے اور اس میں ایک انفرادی شان ہے" — ڈاکٹر عبادت بریلوی

نیا ایڈیشن — آفسٹ طباعت

ہماری معیاری کتابیں

اقبال اور سید سلیمان ندوی	طاہر تونسوی -/۲۰
اقبال ادیبوں کی نظر میں	ظفر اقبال -/۱۰
اقبال اور مجدد عصر	ڈاکٹر سہیل بخاری /۳۰
اقبال احوال و افکار	ڈاکٹر عبادت بریلوی /۲۵
اقبال اور مشاہیر	طاہر تونسوی -/۳۵
اقبال پر پندرہ مقالات	احسان الٰہی سالک -/۳۰
بانگ درا عکسی	علامہ اقبال -/۹
بال جبریل عکسی	" " /۹
ضرب کلیم عکسی	" " /۸۵۰
ارمغان حجاز عکسی	" " -/۴
فرہنگ عامرہ عکسی	محمد عبداللہ خویشگی -/۲۵
اردو ادب میں طنز و مزاح	ڈاکٹر وزیر آغا -/۲۰
آغا حشر کے ڈرامے	وقار عظیم -/۳۰
اشاریہ کلام فیض	ڈاکٹر عقیل احمد -/۱۲
فیض ایک جائزہ	سید اشفاق حسین -/۱۵
اردو میں ڈرامہ نگاری	سید بادشاہ حسین -/۱۵
زادِ راہ - بہترین افسانے	منشی پریم چند -/۷۵۰
علمی نقوش	ڈاکٹر غلام محمد مصطفےٰ -/۲۰
کلام ظفر فن اور شخصیت	خواجہ تہور حسین -/۲۰
اردو میں فن سوانح نگاری	الطاف فاطمہ -/۱۵
انتخاب کلام ظفر	بہادر شاہ ظفر -/۶
ہماری داستانیں	سید وقار عظیم -/۲۵
ارباب نشر اردو	مولوی سید محمد ایم اے -/۱۵
رحمۃ للعالمین کامل مجلد	قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری -/۶۶۵۰
غنیۃ الطالبین " "	شیخ عبدالقادر جیلانی -/۴۵

ہماری معیاری کتابیں

مقدمات عبدالحق	ڈاکٹر عبادت بریلوی -/۱۵۰
جاوید نامہ مع شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی -/۱۵۰
مثنوی سچ باید کرد مع شرح	" " " -/۷۵
پیام مشرق مع شرح	" " " -/۷۵
بانگ درا مع شرح	" " " -/۲۵
بال جبریل شرح	" " " -/۱۸
ضرب کلیم شرح	" " " -/۱۶
ارمغان حجاز مع شرح	" " " -/۱۲
رموز بے خودی مع شرح	" " " -/۴۰
اسرار خودی مع شرح	" " " -/۶۵
اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر -/۵۰
اقبال اور عشق رسولؐ	پروفیسر عبدالرشید -/۱۵
اقبال اور پیروی شبلی	سید افتخار حسین ۱۶/۵۰
اطراف اقبال	ملک حسن اختر -/۳۰
یادِ اقبال	ڈاکٹر عبدالحمید -/۷
مطالعات اور مکاتیب	سید اختر الاسلام -/۲۵
اقبال اور عبدالحق	ڈاکٹر ممتاز حسین -/۱۰
اقبال کی شاعری اور اس کا پیغام	شیخ اکبر علی -/۳۰
اقبال نئی تشکیل	ڈاکٹر عزیز احمد -/۴۰
حیات اقبال عکسی	طاہر تونسوی -/۳۰

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان دہلی ۲